لوٹ آ میرے ساتھی
آمنہ اقبال احمد

وہ سیاہ بل کھاتی پتلی سی سڑک پر دور تک نکل گیا تھا۔ وہی بائیں جانب ہری بھری اونچی نیچی پہاڑیاں تھیں، دائیں طرف طویل و عریض ابھری تراشیدہ چراگاہیں تھیں، سڑک کے دونوں طرف سدا بہار جھاڑیاں، اُن سے مستقل لپٹی پھولدار بیلیں تھیں اور ـــــ دور چراگاہوں کے اُس پار دریا کے سیمیں پانیوں کو چوم کر آتیں تروتازہ اور یخ بستہ ہوائیں تھیں۔ پر ـــــ آبادی کوئی نہیں تھی!

اُس نے گاڑی واپس موڑ لی۔ ایک بار پھر وہ دائیں جانب اونچی یک و تنہا پہاڑی پر واقع وسیع و عریض، ایکڑوں پر پھیلی پُرشکوہ حویلی کے قریب آ رہا تھا۔

تبھی ـــ اُس نے دیکھا۔ اوپر کاسل میں سے نکلتی ایک کار پہاڑی کے گرد چکر

کافی آہستہ آہستہ نیچے سڑک کی طرف آ رہی تھی۔

اُس نے رفتار دھیمی کر لی۔ کہ گاڑی سڑک پر آ کر اپنی راہ لے۔ سرخ رنگ کی latest model سپورٹس کار! ایک لڑکی چلا رہی تھی۔ سڑک پر آتے ہوئے وہ اُس کے آگے ہو لی۔ وہ بھی پیچھے پیچھے جانے لگا۔

لڑکی چند میٹر ہی گئی تھی۔ کہ گھرر رر... گھرررر کر کے گاڑی رک گئی۔ وہ باہر نکلی۔ بونٹ کھولا۔ ایک نظر انجن پر ڈالی۔ مگر شاید کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

تبھی زار نے گاڑی بائیں طرف کھڑی کی۔ اُس کے پاس چلا آیا۔

"Can I help you?" اُس نے کہا۔

لڑکی نے جھکا سر اٹھایا۔ اُس کی طرف دیکھا۔

"پتہ نہیں کیا خرابی ہو گئی ہے؟" وہ ایک طرف ہوتے ہوئے بولی۔ جیسے چاہتی تھی کہ وہ اُس کی مدد کرے۔

وہ انجن پر جھک آیا۔ کوئی نقص نہیں تھا۔ پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ گاڑی سٹارٹ کی۔ فیول کی سوئی بالکل نیچے ڈراپ کر رہی تھی!

ایک مبہم سی مسکراہٹ، اُس کے پُرکشش لبوں کو چھو گئی۔

"پیٹرول ختم ہے میم"۔ وہ گاڑی سے باہر آتے ہوئے بولا۔

"اوہ"۔ وہ کچھ خجل سی لگنے لگی۔ کہ اُسے اِتنا بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

"گھر سے نکلنے سے پہلے ایک نظر فیول پر ضرور ڈال لیا کیجئے۔" ایک سرسری سی نظر اُس پر ڈالتے ہوئے اُس نے مزید کہا۔

پتہ نہیں کیوں؟ وہ کچھ سٹپٹا سی گئی۔

"اب؟ کیا کریں گی؟"

اُس نے مزید اپنی مدد کی آفر اس لئے نہیں کی۔ کہ اُس کا گھر بالکل پاس ہی تھا۔ نوکر چاکر کتنے ہوں گے؟ یہ بھی اندازہ بخوبی ہو رہا تھا۔ اِس کے باوجود --- ایک لڑکی ہونے کے ناطے کرٹسی کی خاطر اُس نے پوچھ ہی لیا۔

"یہ پاس ہی میرا گھر ہے۔" اُس نے اوپر اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

"ڈرائیور آ جائے گا۔ کچھ کر لے گا"۔

"اوکے"۔ اُس نے جانے کو قدم بڑھائے۔

"تھینک یو ویری مچ"۔ لڑکی نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

"It's okay." وہ بولا۔

اور --- اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

چکر کاٹتی سڑک اب بائیں جانب چاندی جیسے چمکتے دریا کے قریب تر ہو رہی تھی۔ وسیع و عریض پاسچرز میں مُنی مُنی سفید سفید بھیڑیں چر رہی تھیں --- دائیں طرف ہری بھری اونچی نیچی پہاڑیاں، اُن پر ایستادہ قد آور درخت تھے۔ سامنے کولتار کی پتلی وائینڈنگ سڑک اور --- بہت تیز ہوا تھی!

مسحور سا وہ آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

معاً ہلکا سا ہارن ہوا اور --- اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ سڑک کافی پتلی تھی۔ اور وہ پیچھے سے آنے والی گاڑی کا راستہ روک رہا تھا۔

اُس نے گاڑی بائیں طرف کر لی۔

پچھلی گاڑی پاس سے گزرنے لگی۔ وہی لڑکی تھی۔ کچھ دیر قبل والی۔ جس کی گاڑی کا پیٹرول ختم ہو گیا تھا۔

سٹیئرنگ پر رکھے ہاتھ کے اشارے سے اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہ آگے

نکل گئی۔

لنچ کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ ہوٹل نہیں گیا۔ دائیں جانب کچھ فاصلے پر سڑک سے قدرے ہٹ کر ایک چھوٹا سا بوسیدہ لکڑیوں کا بنا جھونپڑی نما ریسٹورانٹ تھا۔ 'River Bend Restaurant' آتے وقت بھی اُس نے دیکھا تھا اِسے۔ دیہاتی سا look تھا اِس کا۔ چھوٹی چھوٹی سی دو چار دھوئیں سے ملگجی شیشوں والی لالٹینیں بھی لٹک رہی تھیں اِس کے آگے۔ نام اور قدامت اُسے اٹریکٹ کر گئے تھے تب بھی۔

آگے بڑھتے ہوئے اُس نے گاڑی دائیں جانب ریسٹورانٹ کے راستے پر ڈال لی۔ پارکنگ میں اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اُس لڑکی کی گاڑی بھی پارک ہوئی تھی۔

ایک موہوم سی مسکراہٹ اِس وقت پھر اُس کے لبوں کو چھو گئی۔

گاڑی لاک کرتے ہوئے وہ ریسٹورانٹ کی طرف بڑھا۔ ایک ٹپ ٹاپ یونیفارمڈ بیرے نے بہت جچے تلے انداز میں اُس کے لئے دروازہ کھولا۔ وہ اندر داخل ہوا۔

اُسے حیرت ہوئی باہر سے جو ریسٹورانٹ بہت معمولی سا لگ رہا تھا۔ اندر سے اُتنا ہی شاندار تھا۔ چھت سے لیکر فرش تک، کھڑکیوں سے لے کر فرنیچر تک ـــ ہر چیز قدیم ترین look دے رہی تھی۔

سیاہ لکڑی کے بیموں کی نیچی سی چھت، بہت پرانے طرز کے درودیوار، چھت سے لٹکتے پیتل کے قدیم وزنی فانوس، پرانے طرز کی میز کرسیاں، پر ـــ ہر میز پر سفید براق میز پوش، جدید ترین کراکری و کٹلری، یہاں وہاں سرو کرتے شفاف یونیفارمز میں

ملبوس چاق و چوبند بیرے!

آگے بڑھتے ہوئے وہ ایک کونے والی میز پر بیٹھ گیا۔ مینیو کارڈ کھولا۔ پاکستانی، چائنیز اور کونٹیننٹل کھانوں کی لمبی لمبی لسٹیں تھیں۔ سلاد بار تھا، ڈیزرٹ بار تھا، بیوریجز تھے۔

وہ ریسٹورانٹ بنانے والے کے ذوق کی داد دیئے بنا نہ رہ سکا۔

اُس نے بیف سٹیک آرڈر کیا۔ اور ٹانگیں میز کے نیچے سیدھی پھیلاتے ہوئے سر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔

وہ لڑکی بھی پرے کونے والی ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ اکیلی ہی۔ کچھ چائنیز کھاتے ہوئے کھڑکی کے اُس پار تک رہی تھی۔ ایک دو چمچ لینے کے بعد رخ اندر کی طرف کر لیا۔ نظروں ہی نظروں میں اِردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ تو نگاہ زار پر آ ٹکی۔ اُسے اپنی ہی طرف دیکھتے پا کر اُس کی سیاہ خمیدہ پلکیں لرز سی گئیں۔ پھر دھیان اپنے کھانے پر لگا دیا۔

زار نے نظریں کھڑکی کی طرف کر لیں۔ دُور اُس پار دیکھنے لگا۔

ہری بھری لمبی لمبی گھاس سے اَٹی اونچی نیچی پہاڑیاں، ڈھلانی چراگاہیں اور ـــ جھکے جھکے بادل!

کوئی آبادی نہیں۔ نیچر ہی نیچر! وہ من میں جذب کرنے لگا۔

کراکری اور کٹلری کی کھنک سے اُس کی محویت ٹوٹی۔ اُس نے رخ اندر کی طرف کر لیا۔ بیرا اُس کے آگے کھانا لگا رہا تھا۔

وہ 'Jade Hills Hotel' پہنچا۔ پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی

اور — پگڈنڈی پر شورٹ کٹ لیتا اوپر اپنے سویٹ کی طرف آنے لگا۔

سرسبز پہاڑیاں، ہری بھری گھاس، ہرے ہرے پاسچرز — ہوٹیل کے نام نے اِن تمام ہریالیوں کے سحر کو خوبصورتی سے اپنے اندر سمیٹ لیا تھا!

اُس نے سویٹ کھولا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ اور سیدھا بستر میں گھس گیا۔

صبح بہت سویرے جاگا تھا۔ اِس وقت غنودگی نے آلیا بے خبر ہو کر سوگیا۔

آنکھ کھلی تو شام کے چار بج رہے تھے۔ واش روم جا کر اُس نے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ فریش ہوا۔ اور اپنے سویٹ کے چھوٹے سے خوبصورت کچن میں آ گیا۔

الیکٹرک کیٹل میں پانی ڈال کر سوئچ آن کیا۔ مگ میں کوفی ڈالی، اوپر سے کھولتا ہوا پانی انڈیلا۔ اور چمچ چلاتا اپنے بیڈروم کی بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔

اِرد گرد نگاہ کی۔ اُس کا سویٹ پہاڑی کے بالکل ٹاپ پر تھا۔ نیچے ڈھلان پر چند اور بھی بالکل اِسی طرز کے سیاہ پتھر کے بنے چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں اور نیچی نیچی چھتوں والے سویٹس تھے۔ نیچے پتلی چکر دار سڑک، پھر پاسچرز اور دور اُس پار دریا کا نیلگوں پانی رواں دواں تھا۔

کہنے کو گرمیوں کا موسم تھا۔ مگر یہاں اِس قدر سردی تھی۔ ہر وقت چلتی ہوا اتنی سرد تھی کہ جم جم جاتا تھا بندہ!

اُسے بھی تو ایسے موسم سے عشق تھا۔ اوور کوٹ کا کالر چڑھائے ایک ہاتھ میں کوفی کا مگ اور دوسرا کوٹ کی جیب میں دیئے جادو بھرے ماحول سے محظوظ ہو رہا تھا۔

گھونٹ گھونٹ کر کے کافی پیتا، دور اُس پار نظریں جمائے، جانے کہاں سے اُسے صبح والی لڑکی کا خیال آ گیا۔

گندمی رنگت، سادہ سے نقوش، بائیں گال پر ایک عدد ڈمپل — پر بلا کی کشش تھی اُس میں!

اچھی سی بھی تھی۔ سارا وقت ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ اُس سے نظریں ملتی تھیں، تو پلکیں جھک جاتی تھیں۔

اس کے باوجود — اتھارٹی سی تھی اُس کی شخصیت میں۔ دبدبہ سا تھا انداز میں۔ اتنا — کہ بمشکل بیس سال کی ہوتے ہوئے کسی کو بھی مرعوب کر سکتی تھی!

اُس نے گہری سانس لی۔ قریبی کرسی پر بیٹھا۔ اور خالی مگ نیچے رکھتے ہوئے جنت نظیر نظاروں پر نظریں جما دیں۔

کتنی ہی دیر گزر گئی۔ جانے کن سوچوں میں گم تھا وہ۔ تند ہواؤں کو چیرتی محسوس ہوئی۔ تو حواسوں میں آ گیا۔

پہاڑی کی ہریالیاں، ہرے بھرے پاسچرز اور دُور دریا کا پانی، سبھی ڈوبتے سورج کے سیندور میں رنگے جا رہے تھے۔

وہ اندر آ گیا۔

ڈریس اَپ ہوا، گاڑی کی چابی لی، سویٹ لاک کیا۔ ایک بار پھر شورٹ کٹ کرتا نیچے آیا، پارکنگ میں کھڑی گاڑی میں بیٹھا۔ اور اِس چھوٹے سے خوبصورت علاقے کی سیاہ بل کھاتی سڑک پر دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔

بے انتہا خوبصورت جگہ تھی۔ قدرت نے بے پایاں حسن لٹایا تھا یہاں۔ قدم قدم پر فطرت سرگوشیاں کر رہی تھی!

اب کے وہ مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ اِس طرف یہاں کا مختصر سا بازار تھا، معمولی سے ہوٹلز تھے، بینک تھا، سکول تھا۔

سب کچھ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ قبل وہ جہاں سے آیا تھا۔ وہاں بہت شور تھا، بہت ہنگامہ تھا۔ انسانوں اور ٹریفک کا سیلاب تھا!

کل رات یہاں پہنچا۔ تو لگا۔ سب کچھ ساکت ہو گیا تھا۔ Pin drop silence ہو گئی تھی — سرور تھا جس میں، نشہ سا تھا، خمار سا تھا!

وہیں ایک چھوٹے سے ہوٹیل میں لکڑی کی بوسیدہ سی کرسی پر بیٹھ کر اُس نے رات کا کھانا کھایا۔ دال اور گرم گرم روٹی۔ دل خوش ہو گیا۔ اوپر سے چھوٹے سے میلے سے کپ میں مزیدار کھولتی ہوئی چائے پی۔ تو فائیو سٹار ہوٹیل کی چائے ہیچ لگنے لگی۔

اُس نے ضرورت کی چند چیزیں خریدیں۔ اور واپس آ گیا۔

دیر تک ٹی وی پر نیوز اور ویوز دیکھنے کے بعد لائیٹ آف کی۔ رات کے کپڑے پہنے، اوپر اوور کوٹ لیا اور — بالکنی میں آ نکلا۔ تُند ہوا کے وار سہتا چند پل وہیں کھڑا رہا۔

چاروں اور سکوت تھا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ ہاں — دور پانیوں میں چلتی ایک موٹر بوٹ میں مدھم سی روشنی ہو رہی تھی اور بس!

وہ اندر چلا آیا۔ کوٹ اتار کر صوفے کی پشت پر ڈالا، نرم و گداز بستر میں گھسا اور — تھکی تھکی آنکھیں موندلیں۔

بالکنی کے دروازے کے فل لینتھ شیشوں میں سے روشنی چھن چھن کر آنے لگی۔ تو اُس کی آنکھ کھل گئی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھی اپنی رِسٹ واچ اٹھا کر دیکھی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔

وہ اٹھا۔ ہاتھ منہ دھوئے۔ اور حسبِ معمول نیچے روڈ سائیڈ پر جوگنگ کے لئے چلا آیا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ہُو کا عالم تھا۔ ریلیکس ہو کر اُس نے جوگنگ کی۔ اور دوبارہ اوپر آ گیا۔

فون پر ناشتہ اپنے سویٹ میں منگوایا۔ ڈریسنگ روم گیا۔ تیار ہوا۔ اور چھوٹے سے خوبصورت living room میں آ گیا۔ بیرا ابھی اُسکا ناشتہ کونے میں لگی

ڈائننگ ٹیبل پر لگا گیا تھا۔

ناشتہ کر کے وہ بیڈروم میں آیا۔ گرے اِش گرین ٹراؤزرز، ڈارک گرین شرٹ پر ہاف لینتھ ڈرٹی گرین اوور کوٹ پہنا۔ سویٹ لاک کیا۔ سویٹ کے گرد گھومتے ہوئے سامنے والی پگڈنڈی پر آکر نیچے پارکنگ میں آیا۔ گاڑی سٹارٹ کی اور --- سڑک پر آتے ہوئے بائیں جانب چلدیا۔

صبح اور بھی پیاری تھی۔ یہاں کا ہر پل ہر لحہ پُر فریب حسن لئے تھا۔ کُہر تھی بہت زیادہ۔ ہیڈ لائیٹس آن کئے وہ احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ بائیں جانب سرسبز پہاڑی پر اِکا دُکا مکان نظر آرہے تھے۔ اِس پہاڑی قصبے میں ملک کے گِنے چنے لوگ ہی گھر بنا سکتے تھے۔ یہ جتنا لازوال حسن لٹا رہا تھا۔ اتنا ہی مہنگا بھی تھا!

آبادی اب ختم ہوگئی تھی۔ بائیں طرف دریا کا گہرا ترین پوائینٹ اور اُس پر واقع 'Blue waters coffee shop' بھی گزر چکی تھی۔ وہ چھوٹا سا ہٹ نما پرکشش ریسٹورانٹ بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ وہ کل والی لڑکی کا ایکڑوں پر محیط کاسل بھی پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

اب۔ بالکل غیر آباد علاقہ تھا۔ آگے سڑک ضرور جاتی تھی، ہری بھری پہاڑیاں بھی تھیں، سرسبز چراگاہیں اور گھنے قد آور درخت بھی تھے مگر --- آبادی نہیں تھی۔

ہاں --- دریا کے اُس پار دور بہت دور کسی اور آبادی کے دھندلے دھندلے آثار نظر آرہے تھے۔

وہ کل بھی یہیں تک آیا تھا۔ یہیں سے واپس مڑا تھا۔ اب بھی گاڑی واپس موڑ لی۔ آگے جانے لگا۔

آبادی اب قریب آرہی تھی۔ اِس دوران چکر دار سڑک نے کئی کروٹ لئے

تھے۔ اِس وقت دریا کا نیلگوں پانی اُسکے دائیں بالکل قریب سے بہہ رہا تھا۔

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ بائیں جانب تا حدِ نظر چیری اور بادام کے باغات تھے۔ چیریز پک کر تیار ہو چکی تھیں اور --- اَدھ پکے بادام اپنی پھلیوں میں چھید کئے جھانک رہے تھے۔ وہیں کچھ فاصلے پر ایک گودام سا بھی نظر آیا۔ چوکیدار بھی تھا وہاں۔ لپک کر اُسکی طرف آنے لگا۔

وہ رُک گیا۔ معلوم ہوا۔ یہ ایک پرائیویٹ سڑک تھی اور اُس کو اِسے استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا!

یہ اُس نے بھی نوٹ کیا تھا۔ گو سڑک پکی روڈ سے ہی نکلی تھی۔ مگر شنگل روڈ تھی۔ کولتار نہیں۔

مزید پتہ چلا کہ یہ بیگم شاہنواز خان کی اسٹیٹ تھی اور --- شارعِ عام نہیں تھا!

معذرت کرتے ہوئے اُس نے گاڑی واپس موڑ لی۔ گھڑی پر نگاہ کی۔ دس بج چکے تھے۔ اُس نے دیکھا چیریز کے باغ میں کچھ لوگ Plucking میں مصروف تھے۔ اُس نے چیری کے درخت پہلے بھی دیکھے تھے۔ مگر اِس افراط سے اور اِس قدر لدے پھندے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

کام میں مصروف بندوں کو دلچسپی سے تکتا وہ دھیمی رفتار سے چلا جا رہا تھا۔

انہماک ٹوٹا۔ تو دیکھا۔ پکی سڑک تو پتہ نہیں کس طرف تھی۔ یہی روڈ البتہ اُسی کل والی لڑکی کے کاسل کے پچھلے سائیڈ کے ایک گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اُس کا کاسل پوری پہاڑی کا احاطہ کئے تھا۔ پہاڑی کے نشیب وفراز کے ساتھ ساتھ کاسل بھی اوپر تلے بنا تھا۔ اِس طرف کاسل اگلے سائیڈ کی نسبت خاصا نیچے چلا آیا تھا۔ جو اُسکے گرینجر کو مزید جلال بخش رہا تھا۔

وہ بھی گیٹ سے چند قدم دور ہی تھا کہ وہی لڑکی اپنی اُسی سرخ سپورٹس کار میں گیٹ سے باہر نکلتی دکھائی دی۔ پاس آئی تو گاڑی روک لی۔ وہ بھی رک گیا۔

''ہائے''۔ وہ شیشہ نیچے کرتے ہوئے بولی۔

''ہیلو'' اُس نے کہا۔

''سر! آپ میری پرائیویٹ روڈ کراس کر رہے ہیں''۔ وہ خوش خلقی سے مزید بولی۔

''اوہ۔'' تو اِس لئے رکی تھی وہ۔ ''I am sorry. مجھے واقعی معلوم نہیں تھا۔''

''Never mind.'' وہ قدرے مسکرائی۔ تو گال کا ڈمپل گہرا ہو گیا۔ ''آپ یہاں نئے آئے ہیں نا...''

''اوہ۔ تو آپ جان لیتی ہیں کہ یہاں کون نیا آیا ہے۔'' وہ خوشگواری سے بولا۔

''جی۔ میں جان لیتی ہوں۔'' وہ بھی اُسی لب و لہجے میں بولی۔

''اچھا۔ کل والی روڈ پر تو ٹھیک ہے نا؟'' اُس کے لہجے میں شرارت سی بھی تھی۔

''ہاں۔ وہ گورنمنٹ کی ہے میری نہیں''۔

''اور ___ وہ...؟'' اُس نے اُس پار دو اور بھی کچے راستوں کی طرف اشارہ کیا۔ جو اُسی کے گھر کو آتے تھے۔ اور جو یقیناً اُسی کے تھے۔

''یہ سارے راستے مجھ تک آتے ہیں''۔ وہ سادگی سے بولی۔

''اور ظاہر ہے میں آپ تک تو آ نہیں سکتا''۔ اُس نے ایک نظر اُس پر ڈالتے ہوئے کہا۔

اُسکی بات میں سادگی نہیں تھی۔ معنی تھی اُس میں!

اِس وقت پھر ___ اُسکی سیاہ لمبی پلکیں جھک گئیں۔

''اچھا میں گاڑی واپس موڑتا ہوں۔'' ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ لئے اُس نے کہا اور ___

آگے بڑھتے ہوئے اُس کے گیٹ کے پاس جا کر گاڑی واپس موڑ لی۔

خاصی دور تک وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ کبھی موسم اور ماحول سے لطف اندوز ہوتا ہوا اور ___ کبھی کسی سوچ میں گم!

دائیں طرف 'River Bend Restaurant' کے مخالف سڑک کے بائیں جانب ایک سرسبز ٹیلے کے عقب میں کئی گاڑیاں پارک ہوئی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

پہلے تو اُس کا دل چاہا۔ ریسٹورانٹ میں جا کر کوفی پی لے۔ مگر پھر ___ اِس طرف بھی گاڑیاں پارک ہوئی نظر آئیں۔ تو سوچا اِس طرف چلا جائے۔

گاڑی لاک کر کے وہ باہر نکلا۔ ٹیلے کی طرف باقاعدہ ٹائیلز کی بنی پگڈنڈی جا رہی تھی۔ وہ اوپر چڑھنے لگا۔ اُس پار کئی ٹورسٹس آئے ہوئے تھے۔ پُر جلال دریا رواں دواں تھا۔ پانیوں کی طرف لوہے کی مضبوط ریلنگ بنائی گئی تھی۔ اور اِس طرف یہاں وہاں لگے بینچ تھے۔ کچھ لوگ بیٹھ کر دریا کنارے کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اور باقی اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔

ایک تنہا کونا دیکھ کر وہ بھی ریلنگ پر آ گیا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ دریا کے پانی کو ساتھ اٹھا کر جب چلتی تو چھینٹے چہرے پر تیز دھار کی طرح لگتے۔

کوٹ کی جیب سے اِمپورٹڈ چوکلیٹ کا پیکٹ نکال کر کھاتے ہوئے وہ وہیں کھڑا دھوپ میں چمکتی چاندی جیسی پانیوں پر نظریں جمائے رہا۔

پھر ___ جانے کی کرنے لگا۔ قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ وہی لڑکی مخالف سمت سے

آتی دکھائی دی۔

دونوں کی نظریں ملیں۔ تو لڑکی کچھ کنفیوزڈ سی نظر آنے لگی۔ بار بار آمنا سامنا جو ہو رہا تھا اُس سے!

زار نے دلکش انداز میں کندھے اُچکائے۔

''اب — کیا کیا جائے ...؟'' اُس کے لہجے میں شرارت تھی، مصنوعی بے بسی تھی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی لڑکی اُسکی بے بسی کے انداز پر مسکرا دی۔

''یہ جگہ بہت چھوٹی ہے۔ ایسا ہو ہی جاتا ہے۔'' لڑکی نے جیسے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ آپ ٹھیک کہتی ہیں'۔ وہ سنجیدگی سے بولا تو —

لڑکی نے چونکتے ہوئے اُسکی طرف دیکھا۔ کہ اب تک وہ بہت کم سنجیدہ ہوا تھا۔

''چوکلیٹ کھائیں گی؟'' اُس نے جواب میں اُسے ہاتھ میں پکڑا چوکلیٹ آفر کیا۔

وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ نہ لیتی تو کرٹسی کے خلاف تھا۔ لے لیتی تو دوستی بن جانے کا اِمکان تھا!

''نو تھینک یو۔ میں چوکلیٹ نہیں کھاتی''۔ اُس نے خالص جھوٹ بولا۔ وہ شاید دوستی سے خوفزدہ تھی۔

پتہ نہیں کیوں؟ زار کے پُرکشش چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

''اوہ''۔ اُس نے کہا۔ چوکلیٹ جیب میں ڈالی اور — اِردگرد نظریں دوڑانے لگا۔

''میں... آگے جاؤں گی''۔ وہ بھی کچھ بجھ سی گئی تھی۔ جانے کیوں؟

''Sure.'' اُس نے کہا۔ اور —

قدم بڑھاتے ہوئے ٹیلے پر سے نیچے اُترنے لگا۔

گاڑی میں بیٹھا۔ اور آگے بڑھنے لگا۔

کافی دور جا کر دائیں جانب مڑتے ہوئے اُس نے گاڑی 'Blue Waters Coffee Shop' کی پارکنگ میں روک لی۔ دو ایک گاڑیاں اور بھی کھڑی تھیں۔

وہ اتر کر سامنے کی طرف بڑھا۔ دریا اب اِس رخ پر تھا۔ وہ کنارے پر گیا۔ یہ دریا کی گہرائی کا Maximum Point تھا۔ لوہے کے مضبوط جنگلے کو تھامے تیز ہوا کی زد میں کھڑا چند پل وہ نیچے اتھاہ گہرائیوں میں بے شمار پانیوں کو تکتا رہا۔ پھر — قریب ہی کوفی شاپ کے اندر چلا گیا۔

کافی آرڈر کی ہی تھی۔ کہ وہ لڑکی اندر داخل ہوئی۔

بے خیالی میں چلتی اُس کے بالکل نزدیک دائیں طرف والی ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئی۔

وہ بڑے مزے سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ جلدی ہی لڑکی کی نظر اُس پر پڑ گئی۔

ایک بار پھر اُس نے خوبصورتی سے کندھے اُچکائے۔

''یہ جگہ بہت چھوٹی ہے۔ ایسا ہو ہی جاتا ہے''۔ اُس نے اُسی کے الفاظ دہرائے۔

وہ مسکرا دی۔ پتہ نہیں کیوں اُسے خوشی سی ہوئی۔ اِس وقت اُس کے چہرے پر وہ سایہ سا نہیں تھا۔ جو گھنٹہ بھر قبل اُس کے چوکلیٹ سے انکار پر اُسکے چہرے پر لہرایا تھا۔

''نہیں — میرے ساتھ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا''۔ پہلے تو اُس نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔ مگر اب ٹھیک بولی تھی۔

''اب پلیز! یہ مت کہیئے گا۔ کہ میں آپ کا پیچھا کر رہا ہوں''۔

وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

''نہیں۔ میں ایسا نہیں کہوں گی...''

''اور اگر میں — ڈرتے ڈرتے کہوں کہ آپ میرا پیچھا کر رہی ہیں تو؟''

اُس نے نظریں اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ وہاں کوئی ڈر وَر نہیں تھا۔ سینہ زوری ضرور تھی!

''نہیں۔ آپ ڈرتے ڈرتے ایسا مت کہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کا پیچھا نہیں کر رہی''۔ وہ وثوق سے بولی۔

اور — زار کا خوشگوار قہقہہ بلند ہوا۔

کوفی آئی۔ تو دونوں اپنی اپنی کوفی پینے میں مصروف ہو گئے۔

دونوں نے اپنی اپنی پے منٹ کی۔ اور باہر نکل آئے۔

''اب میں اپنے ہوٹیل جا رہا ہوں۔ آپ پلیز پیچھا مت کیجئے گا۔'' اُس نے پھر اُسے چھیڑا۔

''نہیں۔ میں آپ کے بالکل مخالف اپنے گھر جا رہی ہوں۔ آپ پلیز واپس مت مڑیئے گا''۔ اُس نے بھی اُسی کے لب و لہجے میں کہا۔

زار کا جاندار قہقہہ گونجا۔

لڑکی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلدی۔ اور زار گاڑی ریورس کر کے سیدھی کرتے ہوئے 'Jade Hills Hotel' کی طرف ہولیا۔

جانے کن سوچوں میں گم — گاڑی چلاتی وہ چلی جا رہی تھی۔

معالمبی سی ہارن سے چونکی۔ گاڑی بائیں طرف کر لی۔ پیچھے سے آنیوالی گاڑی کو راستہ دیا۔

زار تھا۔ گاڑی اُس سے آگے لیجا کر بائیں جانب کھڑی کر دی۔ باہر نکل آیا۔

ہیزل نے بھی گاڑی روک لی تھی۔

''آپ کانوں میں روئی دیکر تو نہیں چلتیں؟'' اُس کے شیشے پر جھکتے ہوئے اُس نے خوشگواری سے کہا۔

''کیا مطلب؟''

"میں کتنی دیر سے ہارن دے رہا ہوں۔ میرا راستہ روکے بڑی شان سے چلی جارہی تھیں"۔

"اوہ۔ ایم سوری۔ میں نے شاید دھیان نہیں دیا"۔

"آپکا دھیان کہاں تھا؟" اُس کا انداز پھر ذومعنی تھا۔

اُس کی پلکیں پھر جھک گئیں۔

"میرا دھیان یہیں تھا"۔

"آپ کا دھیان یہاں نہیں تھا"۔ وہ اب بھی اُس کے پرکشش چہرے پر نظریں جمائے تھا۔

"یہیں تھا"۔ وہ بھی ہار نہیں ماننا چاہتی تھی۔

وہ ہنس دیا۔ دھیرے سے۔

"آپ... ہنس کیوں رہے ہیں؟"

"کیوں؟ آپ کے ٹاؤن میں ہنسنے پر پابندی ہے کیا؟"

وہ بھی ہنس دی۔

"آپ کیوں ہنسی ہیں؟"

"کیوں؟ میرے ٹاؤن میں ہنسی پر پابندی ہے کیا؟" وہ اُسی کے لب و لہجے میں بولی۔

وہ پھر ہنس دیا۔ خوشگواری سے۔

اِکا دُکا گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ اِس طرف کم ہی لوگ آتے تھے کہ آگے کوئی خاص جگہ تھی ہی نہیں۔

"یہاں سے جو بھی بندہ گزرتا ہے۔ اتنا گھور گھور کر کیوں دیکھتا ہے؟" رخ باہر ہی

کی طرف کیے وہ اُس سے بولا۔

"اب یہ بھی میرے ٹاؤن کا قصور ہے شاید؟"

اُسکا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

"نہیں — لیکن اتنا زیادہ کیوں گھور رہے ہیں؟"

آپ بیچ سڑک میں ایک لڑکی کی گاڑی روکے کھڑے ہیں۔ گھوریں گے نہیں تو اور کیا کریں گے"۔

"اچھا — تو بات لڑکی کی ہے..."

"جناب!"

"تو پھر میں — راستہ کھول دیتا ہوں۔ آپ چلیں۔" وہ اُس کی گاڑی سے الگ ہونے لگا۔

اس نے گاڑی سٹارٹ کردی۔ زار کی نظر اپنی گھڑی پر گئی۔

"آپ آ کہاں سے رہی ہیں؟" وہ اپنے گھر کے آس پاس ہی تو تھی!

"میں بنک گئی تھی۔ کچھ کام تھا"۔ وہ اب بھی انجن سٹارٹ کیے بیٹھی تھی۔

"اب گھر جارہی ہیں؟"

"ہاں"۔

"چلیں۔ میں بھی اُسی طرف جارہا ہوں"۔

"کیا مطلب؟"

"کیوں؟ میں آپ کی طرف نہیں جاسکتا؟"

"تو"۔ وہ مسکرادی۔

"دیکھتے ہیں"۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

اُس کے آگے آگے چلنے لگا۔

عجیب آدمی تھا۔ بڑی آسانی سے اُس پر اپنی مرضی مسلط کر لیتا تھا۔ پر — پتہ نہیں کیوں؟ اُس کا اُس کی طرف جانا اُسے اچھا سا لگا۔

دونوں آگے پیچھے اُس کے علا[illegible]ئے۔ اُسی پچھلے گیٹ والے رخ سے۔

گیٹ سے کچھ اِدھر ہی اُس نے گاڑی [illegible] شاید اپنے گھر کے لوگوں کے سامنے اُس کی ہمراہی میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ بہرحال — زار بھی گاڑی روک کر اُس کے پاس آ گیا۔

''اچھا سائیں میم صاحب۔ کیا حال چال ہیں آپ کے''۔ ایک بار پھر اُس نے اُس کی گاڑی سے ٹیک لگالی۔

''میرے حال چال ٹھیک ہیں۔ آپ بتائیں یہاں کیا کام تھا؟''

''یہاں؟''

''ہاں۔''

''اُمممم — سوچتا ہوں...''

وہ بے اختیار ہنس دی۔

''یہ — تمام باغ آپ کے ہیں؟'' اُس نے دور دور تک تاحدِ نگاہ پھیلے چیری اور بادام کے باغوں کی طرف اِشارہ کیا۔

''ہاں''۔

''میں جا سکتا ہوں اِن میں؟''

''کیا کریں گے جا کر؟'' وہ شاید ایسا نہیں چاہتی تھی۔ یا پھر دوسرے لفظوں میں

اُس کے ساتھ زیادہ فری ہونا نہیں چاہتی تھی۔

''آپ بہت کنجوس ہیں''۔

''کیوں؟''

''آپ کہہ ہی دیتیں کہ جاؤ گھوم پھر لو۔ تو کیا بگڑ جاتا آپ کا؟''

وہ ایک بار پھر ہنس دی۔ جیسے کانچ کی چوڑیاں کھنکی ہوں۔

''چلیں۔ گھوم پھر لیں''۔ اُسے کہنا ہی پڑا۔

''یاد رکھیں۔ یہ سارے راستے آپ تک ہی آتے ہیں''۔ اُس نے چند روز قبل کی اُس کی کہی بات اُسے یاد دلائی۔

اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اِس وقت پھر اُس کی سٹون گرے ذہین آنکھوں میں کچھ تھا۔

اُس کی سیاہ خمیدہ پلکیں لرز کر رہ گئیں۔ پھر — فوراً خود کو سنبھالا۔

''مگر آپ... وہیں سے مین روڈ جوائین کر لیں گے۔ ٹھیک ہے؟''

''گھر آنے کو نہیں کہیں گی؟''

''نو''۔ وہ مسکرا بھی رہی تھی۔

''کب تک؟''

''سوچوں گی''۔ کہتے ہوئے اُس نے گاڑی سٹارٹ کی اور —

گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔

وہ بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ اپنے گیٹ کے اندر جانے لگی۔ تو زار بھی واپس مڑ آیا۔ باغات میں تو وہ کبھی کا گھوم پھر چکا تھا۔ اِس وقت تو ویسے ہی اُسے چھیڑ رہا تھا اور بس!

دوپہر کو جو سویا۔ تو شام کی خبر لایا۔ پانچ بج رہے تھے۔

اٹھتے ہوئے وہ واش روم گیا۔ گرم پانی کا شاور لیا۔ تو طبیعت بشاش ہوگئی۔

کچن میں آیا۔ ایک کپ چائے بنانے کا سوچ رہا تھا۔ مگر پھر آئیڈیا ڈراپ کرلیا۔ واپس لِونگ روم میں آ گیا۔ ہینگر سے ڈارک گرے ہاف لینتھ جیکٹ اٹھا کر پہنا۔ اور سویٹ سے باہر نکلتے ہوئے لاک کر کے سویٹ کے گرد گھومتا سامنے کی پگڈنڈی پر آ گیا۔

ہوا سخت سرد تھی، ٹھنڈ جسم کے آر پار ہو رہی تھی اور — اُودی اُودی گھٹائیں اب برسیں کہ اب!

وہ پیدل ہی سڑک پر آ گیا۔ دائیں طرف آبادی کے رخ ہولیا۔

دائیں ہاتھ پر ہری بھری پہاڑیاں، بائیں جانب سڑک کے ساتھ ساتھ چلتی چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی پتیوں والی باڑ، اُس پار تاحدِ نظر ہری ہری چراگاہیں!

بہت خوبصورت لگ رہا تھا سب۔ دور تک پھیلی ابھری ابھری وسیع و عریض چراگاہوں کی جگہ جگہ لکڑی کے سفید جنگلوں سے حد بندی ہوئی ہوئی تھی۔ جیسے مختلف لوگوں کی ملکیت تھیں۔ سفید سفید مُنّی مُنّی بھیڑیں اب بھی غول کی شکل میں جابجا چرتی نظر آ رہی تھیں اور — دور نظروں سے اوجھل وہیں کہیں دریا بھی رواں دواں تھا!

بڑے بڑے قدم اٹھاتا وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ رین کوٹ پہن لیتا۔ تو زیادہ بہتر تھا۔ کہ بادل پانی سے بوجھل ہو رہے تھے۔ کسی بھی لمحے برسنے کو تیار تھے۔ خیر —

وہ اوپر بازار پہنچ ہی گیا۔ لکڑی کے ایک چھوٹے سے کھوکھے میں چائے، پکوڑے اور جلیبی سرو ہوتی تھی۔ وہ وہیں جا کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ چائے آرڈر کی۔ اور — اِردگرد کے ماحول سے لطف اندوز ہونے لگا۔

پورے قصبے کے باسی یہاں سودا سلف خریدنے آتے تھے۔ ٹورسٹس کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور — کمال کی بات تھی کہ دکانداروں نے اپنی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں جہان بھر کی چیزیں مہیا کر رکھی تھیں۔ کہ یہی دو تین مہینے تو سیزن ہوتا تھا۔ کچھ کما لیتے تھے بچارے!

دکان کی ٹین کی چھت پر موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔ تو وہ چونکا۔

یہاں بس ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب جی چاہا، بادل چھا گئے، پھر برس گئے — جب دل چاہا، دھوپ نکل آئی، سکون ہوگیا!

بارش تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ باقی لوگ بھی اِدھر اُدھر دکانوں اور اُن کے چھجوں تلے پناہ لئے کھڑے تھے۔

وہ گھونٹ گھونٹ کر کے مزیدار چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

چائے پینے کے بعد بھی کچھ دیر وہیں بیٹھا رہا۔ مگر کب تک؟

اٹھتے ہوئے اُس نے دکاندار کو پے منٹ کی۔ اور باہر نکل آیا۔

بارش اب بھی خاصی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ بازار اب پیچھے رہ گیا تھا۔ ہوٹل تک اب بھی بہت راستہ تھا۔

تبھی اُس نے دیکھا۔ بازار ہی کی طرف سے آتی وہ لڑکی اپنی کار میں بیٹھی دھیمی رفتار سے چلی آ رہی تھی۔ اُسے دیکھے بھی جا رہی تھی۔

پہلے تو وہ یوں ہی چلتا رہا۔ پھر جانے کیا خیال آیا؟

اُس کی گاڑی کے پیچھے سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گیا۔ اُس کا شیشہ بجایا۔

اُس نے گاڑی روک لی۔ شیشہ نیچے کیا۔

''آپ مجھے لفٹ دیں گی میرے ہوٹل تک؟''

''لفٹ؟'' جیسے اُس نے کوئی انہونی بات کہہ دی تھی۔

''ہاں۔''

''نو۔ سوری''۔ اِس مختصر سے علاقے میں اُسے سبھی تو جانتے تھے۔ کوئی دیکھ لیتا تو؟

وہ اُس کی مجبوری سمجھ رہا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اُسے اپنے بھیگ جانے کی بہت فکر تھی۔ پھر بھی۔۔۔

مزید کچھ کہنے سنے بنا اُس نے اُس کا پچھلا دروازہ کھولا۔ اور آرام سے سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''آپ میری گاڑی کی سیٹ بھگو رہے ہیں''۔ اُس نے کہا۔

''آپ گاڑی چلائیں''۔

وہ بہت bossy قسم کا تھا۔ اُس سے لفٹ بھی۔ لے رہا تھا۔ اور رعب بھی ڈال رہا تھا۔

وہ آگے بڑھنے لگی۔

''آپ نے رین کوٹ کیوں نہیں لیا؟'' جانے کیوں اُس کے لہجے میں concern سی تھی۔

''ہاں۔ یہی میں بھی سوچ رہا تھا''۔

''آپ بہت بھیگ گئے ہیں''۔ کیئر اُس کی آواز سے جھلک رہی تھی۔

''ہاں۔''

''بیمار پڑ گئے تو؟''

''کچھ نہیں ہوگا۔ میں بہت سخت چیز ہوں''۔

چند پل دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔

''آپ کو زکام تو یقیناً ہوگا''۔ وہ پھر بولی۔

''پھر بھی آپ لفٹ نہیں دے رہی تھیں...''

وہ مسکرا دی۔ بولی کچھ نہیں۔

''مجھے نمونیہ ہو جاتا تو؟'' اُس نے اپنے اوپر مصنوعی اندیشہ طاری کیا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔ آپ بہت سخت چیز ہیں''۔ اُس نے اُسی کی بات دہرائی۔

اُس کا خوشگوار قہقہہ بلند ہوا۔

معاً۔۔۔ ہیزل کی نازک سی چھینک اُبھری۔

''بائے دا وے ۔۔۔ آپ کو کس حکیم نے مشورہ دیا تھا اتنی بارش میں باہر گھومنے کا؟''

''مجھے صبح سے چھینکیں آ رہی ہیں''۔

''اوہ۔۔۔ میں نے سنا ہے چھینکیں آتی ہیں تو کوئی یاد کر رہا ہوتا ہے...''

''مجھے کوئی یاد نہیں کرتا''۔

''کیوں؟ آپ اتنی بُری تو نہیں ہیں''۔

اُس کی بے سروپا باتوں پر اُسے ہنسی آ گئی۔

''آپ کی پرفیوم بہت زبردست ہے''۔ وہ بھی چپ رہنے والا نہیں تھا۔

وہ خاموش رہی۔ کہتی بھی کیا؟

''یہ لڑکیاں پرفیوم لڑکوں کو اٹریکٹ کرنے کے لئے تو نہیں لگاتیں؟'' اُس نے اُسے چھیڑا۔

"نو سر۔ پرفیوم خود کو اچھا لگتا ہے۔ فریشنیس کا احساس ہوتا ہے"۔

"آپ شاید بُرا مان گئیں"۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"آپ — اتنا کم کیوں بولتی ہیں؟"

"آپ بولتے ہیں نا میری جگہ"۔

اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

"آپ کو مجھ جیسا Companion بار بار نہیں ملے گا۔ میری قدر کریں"۔

وہ بے ساختہ ہنس دی۔

"آپ چُپ ہونے کا کیا لیں گے؟"

"ٹھیک ہے۔ میں اب نہیں بولوں گا"۔

وہ واقعی خاموش ہو گیا۔

گاڑی چلتے چلتے اُس کے ہوٹیل کے قریب پہنچ گئی۔ بارش اب بھی جاری تھی۔

"لیجیے۔ آپ کا ہوٹیل آ گیا"۔ 'Jade Hills Hotel' اُسے معلوم تھا۔ یہاں کا جانا مانا ہوٹیل تھا۔ اُس نے رفتار کم کر لی۔

"نو مَیم۔ جب تک بارش نہیں رکتی۔ میں گاڑی سے نہیں اُتروں گا" وہ آرام سے سیٹ پر نیم دراز تھا۔

"واہ۔ اچھی زبردستی ہے"۔

"وہ — ٹاپ پر میرا سویٹ ہے۔" اُس نے دور اشارے سے بتایا۔ "آپ چاہتی ہیں کہ میں وہاں تک بھیگتا ہوا جاؤں؟"

واقعی — سویٹ خاصی اونچائی پر تھا۔ اندھیرا بھی تھا۔ بارش بھی تھی۔ پر — وہ کیا

کرتی؟

"پھر؟"

"پھر یہ کہ — آپ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہیں۔ چلتی چلیں۔ کبھی تو بارش رک ہی جائے گی..."

واہ — کیا مشورہ دیا تھا؟

"اچھا آپ ایسا کریں۔ پیچھے بُوٹ میں میری اُمبریلا ہے۔ وہ لے لیں"۔

"وہ... چھوٹی سی... پرنٹڈ سی... امبریلا — جو آپ نے اُس دن بارش میں لی ہوئی تھی..." وہ رک رک کر کہہ رہا تھا۔

وہ بے اختیار ہنس دی۔

"آپ بارش سے تو بچ جائیں گے نا"۔

"نہیں۔ وہ بہت چھوٹی ہے۔ مجھے بارش سے نہیں بچا سکتی"۔

وہ اُس کے ہوٹیل کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ ہر سُو تاریکیاں گھر آئی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی پاس سے گزرتی تو روشنی ہو جاتی اور بس!

"اے مسٹر! آپ کا ہوٹیل آ گیا ہے۔ اب آپ اُتر جائیں۔" اُس نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

"تو آپ کا ارادہ پکا ہے مجھے نمونیا کرانے کا؟"

وہ چپکے سے ہنس دی۔

وہ سیدھا ہوا۔ پھر — جیسے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔

بارش کا ریلا آیا۔ تو وہ فوراً واپس بیٹھ گیا۔

"نو مَیم۔ یہ زبردستی نہیں چلے گی"۔

عجیب چیز تھا۔ زبردستی وہ کر رہا تھا یا وہ کر رہی تھی؟

اُس نے تھکی سی سانس لی۔ سر سیٹ کی پشت سے ٹکا لیا۔

''اِسی طرح تھوڑی دیر ریسٹ کریں۔ بارش رک جائے گی تو میں خود بخود اُتر جاؤں گا''۔ بڑے آرام سے اُس نے ٹانگیں سیدھی پھیلا لیں۔

''اے ابرِ کرم! آج خوب برس۔ برستا ہی چلا جا''۔ اُس نے بادل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ گاڑی سے باہر ہوتے۔ اور یہی کہتے تو میں مانتی''۔

اُس کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''اِسی لئے تو کہہ رہا ہوں۔ کہ گاڑی کے اندر ہوں۔ آپ کی گاڑی کے اندر''۔ اُس نے 'آپکی' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''میری گاڑی میں کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''ہاں''۔

''کیا؟''

''آپکی پرفیوم۔ پاگل کیا ہوا ہے مجھے''۔

وہ بے اختیار ہنس دی۔

''۔ پرفیوم میں آپ دے سکتی ہوں۔ اگر آپ میری گاڑی سے اُتر جائیں تو''۔

''کتنی بیوقوف ہیں آپ۔ پرفیوم تو آپ پر لگ کر رنگ لائی ہے''۔

وہ کچھ جزبز سی ہوئی۔ اُس نے آج تک کسی کو اپنے ساتھ اتنا فری نہیں ہونے دیا تھا۔ کہ مذاق میں بھی اُسے بیوقوف کہہ سکے۔ بہرحال—

کتنی ہی دیر وہ اُس کی الٹی سیدھی باتیں سنتی رہی۔ اور عجیب بات تھی کہ انجوائے

بھی کرتی رہی۔ پر— بارش نے نہ رکنا تھا۔ نہ رکی۔

''او کے میم۔ اب میں چلوں گا۔'' اُس نے اچانک کہا۔ اور بھری بارش میں دروازہ کھول دیا۔

وہ اُسے دیکھتی رہی۔ بولی کچھ نہیں۔

''گڈ نائیٹ''۔ اُس نے مزید کہا اور—

بڑے بڑے ڈگ بھرتا آرام سے بارش میں چل دیا۔

تو— اتنی دیر وہ اُسے خواہ مخواہ روکے رہا تھا! ایک مدھم سی مسکراہٹ اُس کے پرکشش لبوں پر بکھر گئی۔

وہ اب بھی وہیں رکے اُسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ پھر—

ایک گہری سانس لی۔ اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ کیمسٹ کی دکان سے بخار کی گولیاں اور سٹکنگ پلاسٹر خرید رہا تھا۔ دکاندار دوائی نکالنے میں مصروف تھا۔ اور وہ وہیں کھڑا دروازے سے باہر دیکھ رہا تھا۔

آج ہر سُو سنہری دھوپ تھی۔ بے تحاشہ سردی تھی۔ ہوا حسبِ معمول تیز تھی!

تبھی اُس نے دیکھا۔ وہی لڑکی دکان کے آگے سے گزرتی سیدھی آگے بڑھی تھی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ایک جوان آدمی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ کیمسٹ کی دکان بازار کی آخری دکان تھی۔ اِس کے بعد یہ راستہ یہاں سے چند میل اُترائی پر واقع ریلوے سٹیشن کی طرف جاتا تھا۔

اُس نے دوائی لی۔ اپنی گاڑی وہیں کیمسٹ کی نگرانی میں دی۔ اور خود ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے اُس کے پیچھے چلدیا۔

قدیم طرز کی ٹرین تھی۔ پرانے سے کمپارٹمنٹ میں لکڑی کے بوسیدہ بینچ تھے۔

وہ کھڑکی کے قریب ایک کونے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کوئی خاص رش نہیں تھی۔ ابھی ابھی سٹیشن پر خریدا اخبار نکال کر وہ پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔

دھیان گاہے گاہے اُس لڑکی کی طرف چلا جاتا۔ وہ بمعہ اُس آدمی کے ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں تھی۔ آج جانے کس مہم پر نکلی تھی؟

بہرحال — ٹرین آگے بڑھتی رہی۔ تیسرے ہی سٹیشن پر رکی۔ تو وہ دونوں اُتر گئے۔

زار بھی اتر گیا۔ وہیں ایک طرف بینچ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

قریباً پینتالیس منٹ بعد وہ اکیلی واپس آئی۔ اور مخالف سمت سے آتی ٹرین میں بیٹھ گئی۔

زار بھی اُسی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا۔ سیدھا جا کر اُس کے مقابل والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''ہیلو مَیم''۔ وہ خوشگواری سے بولا۔

وہ کچھ کنفیوزڈ سی نظر آنے لگی۔ ساتھ ہی خوبصورت آنکھوں میں دیپ سے جل اُٹھے۔

''ہیلو''۔ وہ دھیرے سے بولی۔

''کیسی ہیں؟''

''فائین''۔

"یہاں کیا کرنے آئی تھیں؟"

"آپ کی ہر بات کا جواب دینا ضروری ہے؟" وہ خوشگواری سے بولی۔

"اُم مم — نہیں"۔ وہ خوبصورتی سے ہنس دیا۔

"آپ کیا کر رہے تھے یہاں؟" اُسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کہ وہ تو اُسی کی تاک میں آیا تھا۔

"مجھے ضروری کام تھا یہاں"۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔

اُس نے بھی زیادہ نہیں کریدا۔ دور اُس پار خوبصورت نظاروں کو تکنے لگی۔

نیوی بلو کوٹ پینٹس، فل سلیوز solid کالر لفٹ پر چھوٹی سی پاکٹ لئے سفید شفاف شرٹ، پاؤں میں ڈارک بلو شوز اور — ٹائیٹ اونچی پونی ٹیل!

لمبے قد اور بہت سمارٹ فگر پر اِس ڈریس میں وہ بہت پیاری اور گریس فل لگ رہی تھی!

"آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں"۔ اُسے دیکھتے دیکھتے وہ دھیرے سے بولا۔

اُس نے رخ اندر کی طرف کر لیا۔

"تھینک یو"۔ وہ مختصراً بولی۔

"اور — اور..."

"اور کیا؟" وہ مسکرا دی۔

"اور ذرا سیکسی بھی لگ رہی ہیں"۔ اُس نے گویا ڈرتے ڈرتے بات پوری کی۔

کہاں سیکسی لگ رہی تھی۔ اچھی خاصی covered تھی وہ تو۔ خواہ مخواہ...

اُس نے گہری سانس لی۔ بولی کچھ نہیں۔ کہ کچھ کہہ دیتی تو بات کو ہیر پھیر کر اُسے

را' کی بجائے 'پوری' سیکسی قرار دے دیتا تو؟

زار نے دو چائے منگوائیں۔ اور اُس سے باتوں میں لگ گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں چائے آ گئی۔ ساتھ میں بسکٹ بھی تھے۔

وہ اپنی چائے پینے لگی۔ زیادہ تکلف نہیں کیا۔ کہ وہ ویسے بھی اُس کی چلنے نہیں دیتا تھا۔ اور پھر اُسے اِس وقت طلب بھی ہو رہی تھی چائے کی۔ فلو ہو جانے کی وجہ سے بخار کی سی کیفیت ہو رہی تھی۔

"مَیم — اپنا نام تو بتائیں"۔ آج اُس نے پہلی بار پوچھا۔

"مجھے نہیں آتا"۔

وہ ہنس دیا۔ خوبصورتی سے۔

"کوئی بات نہیں۔ میں نام جانے بغیر ہی کام چلا لیا کروں گا"۔

"کیا مطلب؟ ابھی اور بھی اتفاقات ہوں گے ملنے کے؟"

"اوہ — ابھی تو شروعات ہیں صرف..."

وہ بے ساختہ ہنس دی اور —

زار کو لگا۔ دور — بہت دور پریوں کے دیس میں جھانجھر بج اٹھے تھے جیسے!

"آپ بھی میرا نام پوچھ لیں۔ اتنی بری بات بھی نہیں"۔

"نہیں۔ میں نہیں پوچھوں گی"۔ وہ نظریں کھڑکی سے باہر جماتے ہوئے بولی۔

"یعنی — آپ کو میری ضرورت نہیں ہے؟"

"نہیں"۔ وہ پھر ہنس دی۔ کیا الٹی سیدھی ہانکتا تھا؟

"اور — جس دن ضرورت پڑی نا۔ تو بلائیں گی بھی تو نہیں آؤں گا..."

"نہیں — مجھے ضرورت نہیں پڑے گی..."

''سوچ لیں''۔

غیر ارادی طور پر اُس نے ایک پل کو آنکھیں بند کر لیں۔

''سوچ لیا''۔

''پھر؟''

''پھر یہ کہ — آپ یہ بسکٹ کھائیں۔ اچھے ہیں۔'' اُس نے بسکٹ کی پلیٹ کی طرف اُس کی توجہ مبذول کرائی۔

اُس نے واقعی ایک بسکٹ اٹھا لیا۔

''آپ نے بتایا نہیں۔ آنکھیں بند کر کے آپ نے کیا سوچا؟''

آنکھیں بند کر کے اُسے سوچ تو کیا آتی؟ اُس کی شکل ضرور سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اور یہ وہ اُسے کیسے بتاتی!

''ہوں۔ بتائیں نا''۔ اُس کی ستون گرے دلنشین آنکھیں اُس پر جمی تھیں۔

''آپ تنگ بہت کرتے ہیں''۔

''آپ بتا دیں پھر تنگ نہیں کروں گا''۔

''اور نہ بتاؤں تو؟''

''تو — تو... ٹھیک ہے مت بتائیں''۔

دونوں ہی ہنس دیئے۔

کچھ دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔

کل بارش میں وہ تھوڑی بہت تو بھیگی ہی تھی۔ سردی بھی شدید تھی۔ چھینکیں تو اُسے اُسی وقت ہی آنا شروع ہو گئی تھیں۔ یہ الگ بات تھی۔ کہ اُس نے زار کے سامنے اقرار نہیں کیا تھا۔ رات تک اُسے زبردست فلو ہو گیا تھا۔ اِس وقت بھی ناک اور

آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شدومد سے چھینکیں آ رہی تھیں۔

''سنیں''۔

وہ خاموشی سے اُسے تکنے لگی۔

''مجھے آپ سے بہت ڈر لگ رہا ہے''۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔

''کیوں؟'' اُسے ہنسی آنے لگی۔

''یقین کریں میں مذاق نہیں کر رہا''۔

''وہی تو پوچھ رہی ہوں۔ کیوں ڈر لگ رہا ہے؟''

''معلوم نہیں کیوں مجھے لگتا ہے آپ اب مجھے آلیں گی کہ اب...''

''اچھا — میں اتنی ڈراؤنی ہوں؟''

''ہاں''۔ وہ بہت سیریس تھا۔

''تو پھر دوسری سیٹ پر بیٹھ جاتے۔ میرے پاس کیوں آئے؟'' وہ سیریس ہونے لگی تھی۔

اُس نے گہری سانس لی۔

''یہی تو مشکل ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں بیٹھ سکتا تھا''۔

''میں دوسری سیٹ پر چلی جاتی ہوں''۔ اُس نے کپ میز پر رکھا۔ اٹھنے کو تھی۔

''بیٹھیں''۔ اُس نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''اور بھی لوگ ہیں کمپارٹمنٹ میں''۔

''تو پھر کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں؟''

''وہ تو میں اب بھی کہوں گا۔ ڈر تو مجھے لگ رہا ہے...''

''پھر وہی؟''

وہ خوشگواری سے ہنس دیا۔

"مجھے آپ کی فلو سے ڈر لگ رہا ہے۔ اور اب آپ کے اٹھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہوگا۔ فلو والا بندہ دور سے بھی گزر رے تو مجھے فلو کر جاتا ہے۔ آپ تو پھر میرے سامنے بیٹھی ہیں..."

"اوہ"۔ اُس نے نجات کی سانس لی۔

اُسے واقعی برا لگا تھا۔ جب اُس نے کہا تھا کہ اُسے اُس سے ڈر لگ رہا ہے!

"اب خوش؟"

"فلو آپ کی وجہ سے ہوا ہے"۔

"کیا مطلب؟"

"رات آپ بھیگے بھیگے میری گاڑی میں براجمان تھے۔ فلو تو ہونا تھا۔"

اُس کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

"بھیگا میں تھا۔ اور فلو آپ کو ہو گیا؟"

"ہاں"۔ وہ بھی ہنس دی۔

"اور آپ کو صبح سے چھینکیں بالکل نہیں آ رہی تھیں۔ آپ کو شام کو ہی ٹھنڈ لگی تھی..."

"آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"پہلی چھینک اور صبح سے آتی چھینکوں کا پتہ چل جاتا ہے۔"

"اوہ"۔ تو اُس نے خواہ مخواہ خود پر پردہ ڈالا تھا!

مسکرا دی اپنا جھوٹ کھلنے پر۔

"اچھا سنیں"۔

"یس۔ میں ہمہ تن گوش ہوں"۔

"اتنی مشکل اُردو بول لیتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ میری قومی زبان ہے"۔

"Oh wow."

"اچھا بولیں۔ کیا سنانے لگی تھیں"۔

"اُم م م... آپ یہاں سے سیدھے اپنے ہوٹل جائیں گے؟"

"آپ کہیں۔ تو نہیں جاؤں گا"۔

اُسے ہنسی آ گئی۔

"پھر کہاں جائیں گے؟"

"جہاں آپ کہیں گی"۔

"آپ سیدھے اپنے ہوٹل چلیں۔ اور ریسٹ کریں"۔

"آپ کو کتنی فکر ہوتی ہے میری۔ ہے نا؟"

"مجھے بالکل فکر نہیں ہوتی آپ کی"۔

"کچھ کچھ — تھوڑی تھوڑی سی..."

"نہیں"۔ وہ ہنس بھی رہی تھی۔

"اتنی سی؟" اُس نے دو انگلیوں کے درمیان سینٹی میٹر بھر کا فاصلہ چھوڑا۔

"نہیں... بال برابر بھی نہیں"۔

جانے کیوں؟ سایہ سا لہرا گیا۔ اُس کے پرکشش چہرے پر!

"مجھے بھی آپ کی کوئی پروا نہیں ہے"۔ وہ معصومیت سے بولا۔

جانے کیوں؟ اُس کو بھی اُسکے چہرے پر کا سایہ اچھا نہیں لگا تھا۔

اُس کی معصومیت پر خوبصورتی سے ہنس دی۔
''آئیں صلح کر لیتے ہیں''۔اُس نے پیشکش کی۔
''نہیں''۔وہ بالکل بچوں کی طرح بولا۔
''پلیز!''
''سوری بولیں''۔
''سوری سر''۔اُس نے خوبصورتی سے کہا۔اور—
زار مان گیا۔مسکراتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔
ہیزل نے دیکھا۔لائیٹ گرے ٹراؤزرز کے ساتھ ڈارک بلو شرٹ میں وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔اُس نے نظریں ہٹالیں۔اندر بیٹھے لوگوں پر سرسری نظر ڈالنے لگی۔
اِس وقت پھر بھی لوگ کافی تھے۔جاتے وقت تو بالکل تھوڑے سے تھے۔یہاں ٹرین میں بس ایسے ہی لوگ سفر کرتے تھے جو کوئی لوڈ وغیرہ ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ورنہ چڑھائی کی وجہ سے بے تحاشا وقت لگنے کی بنا پر لوگ کم ہی سفر کرتے تھے۔ہاں اِن دنوں گردونواح سے لطف اندوز ہونے ٹوورسٹس بھی چلے آتے تھے!
اُس نے چائے ختم کی۔خالی کپ اپنے قریب بینچ پر رکھا۔زار اب بھی گھونٹ گھونٹ کرکے پیتا اپنا کپ ہاتھ میں تھامے تھا۔ہیزل نے دیکھا۔بڑی دیر سے ایک ٹورسٹ لڑکی پرلی سیٹ پر اکیلی بیٹھی—بار بار زار کو دلچسپی سے دیکھے جا رہی تھی۔
''اے مسٹر۔آپ کو کچھ پتہ ہے؟''
''کیا؟''وہ اُس کی طرف متوجہ ہوگیا۔
''وہ—اُس طرف بیٹھی لڑکی آپ کو بہت غور سے دیکھ رہی ہے''۔
''اچھا۔''خالی کپ بینچ پر رکھتے ہوئے اُس نے مختصراً کہا۔

''آپ بھی اُس طرف دیکھیں نا''۔
''کیوں؟''
''خوش ہو جائے گی بچاری''۔
''اور—آپ اُداس ہوگئیں تو؟''وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔
کچھ تھا اُس کی آنکھوں میں۔اُس کی پلکیں سہار نہ سکیں۔لرز کر گر گئیں۔مگر پھر—جلدی سے خود کو سنبھالا۔
''میں کیوں اداس ہوں گی''۔
''شاید''۔
''نہیں۔ایسا نہیں ہوگا''۔
''سوچ لیں''۔
''سوچ لیا ہے''۔
''نہیں سوچا ہے''۔وہ چند پل مزید اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔پھر—نظریں کھڑکی سے باہر جنت نظیر نظاروں پر جما دیں۔
چڑھائی کی وجہ سے ٹرین بہت دھیمی رفتار سے جا رہی تھی۔صبح کے قریباً پونے گیارہ بجے وہ ٹرین میں بیٹھا تھا۔آتے جاتے یہ چند میل کا فاصلہ طے کرتے ٹرین نے گھنٹے لے لئے تھے۔
مگر—وہ بور نہیں ہوا تھا۔ایک تو ماحول میں بے تحاشا حسن بکھرا پڑا تھا۔دوسرے—ہیزل کی کمپنی بھی اُسے اچھی لگ رہی تھی!
وہ اُس کی کمپنی میں خوش تھی یا نہیں؟ اُسے جاننے کی خواہش ہوئی۔
''آپ—بور نہیں ہوئیں؟ گھنٹوں سے ٹرین بس چلتی جا رہی ہے...''

"نہیں"۔ وہ مسکرادی۔

"باہر کا منظر بھی تو بے شمار خوبصورتی لئے ہے۔"

"یہ خوبصورتی تو میں صبح شام دیکھتی رہتی ہوں۔ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"تو پھر تو آپ کو بور ہونا چاہئے"۔

"نہیں۔ ایک تو مجھے ٹرین میں سفر کرنا اچھا لگتا ہے، پھر ..."

"پھر؟"

"کچھ نہیں"۔ وہ مسکرادی۔

جبکہ ... ٹرین کی بات بھی ٹھیک تھی۔ لیکن زارک کی کمپنی — اُس سے بھی زیادہ خوشی کا باعث تھی۔ پہلی بار کوئی ساتھی سا ملا تھا جیسے!

گو ہر بار تقریباً زبردستی آ مِلتا تھا اُس سے۔ مگر ہر بار اپنی دلچسپ باتوں میں الجھا کر بعد میں بھی پہروں اُس کا دھیان بنائے رکھتا تھا!

"آپ کو میرے ساتھ سفر کرنا اچھا نہیں لگ رہا؟" ہیر پھیر والی ttrick کام جاتے دیکھ کر اُس نے براہِ راست پوچھ لیا۔

"آپ کو اچھا لگ رہا ہے؟" اُلٹا اُس نے سوال کر دیا۔

"بہت اچھا لگ رہا ہے"۔ وہ اُس کے پرکشش چہرے پر نظریں جمائے تھا۔

نظریں چراتی وہ سامنے دیکھنے لگی۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا"۔

"کون سی بات کا؟"

اُس نے گہری سی سانس لی۔

"میں آپ کو باہر پھینک دوں گا ٹرین سے"۔ اُس نے جیسے تنگ آ کر کہا۔

"میں مر جاؤں گی"۔

"نہیں۔ آپ نہیں مریں گی"۔

"چلتی ٹرین سے پھینکیں گے اور مروں گی نہیں"۔

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں چلتی ٹرین سے پھینکوں گا۔ ٹرین سٹیشن پر رکے گی۔ تو دھکا دوں گا"۔

وہ ہنس دی۔ خوبصورتی سے۔

پھر - اُسے حیرت بھی ہوئی۔ وہ جو صرف اور صرف 'یس میَم'، Sure Ma'am، 'ویری ویل میَم' — حکم، جو حکم، جیسا حکم' سننے کی عادی تھی۔ وہ جو All Sovereign تھی۔ کیسے اِس آدمی کی ہر بات سن لیتی تھی؟ سن بھی لیتی تھی اور — اُسی کے لب و لہجے میں جواب بھی دے دیتی تھی!

منزلِ مقصود آ چکی تھی۔ دونوں اٹھتے ہوئے ٹرین سے باہر آ گئے۔ پھر — ریلوے سٹیشن سے باہر آ گئے۔

وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ بھی ساتھ ساتھ چلا۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی۔ تو اُس نے بھی اُس کا پچھلا دروازہ کھولا۔ اور آرام سے بیٹھ گیا۔

"آپ ... اپنی گاڑی میں کیوں نہیں جاتے؟" اُسے پھر لوگوں کے دیکھنے کی فکر لگ گئی۔

"میں نے اپنی گاڑی بازار میں کھڑی کی ہے"۔ وہ لاپروائی سے بولا۔

"آپ ... مجھے مروائیں گے"۔

''بالکل نہیں۔ اِس وقت شام ہو چکی ہے۔ باہر سے کسی کو کچھ نظر نہیں آتا''۔

''آپ بھی نا... پوری چیز ہیں''۔ اُس نے گاڑی سٹارٹ کردی۔

بازار آنے سے پہلے ہی وہ گاڑی سے اُتر گیا۔ کیمسٹ کی طرف چلا۔ اور اپنی کار میں بیٹھ کر ہوٹیل کی راہ لی۔

شام ٹیالی ہو رہی تھی۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف چل پڑے تھے اور— دور بائیں جانب سے آتی ریوڑ میں سے ایک مُنی سی بھیڑ کے گلے کی بجتی گھنٹی اُسے صحرا میں چلتے کسی کارواں کی یاد دلا رہے تھے۔

پانی میں ڈالے اُس کی فشنگ راڈ کو جھٹکا لگا۔ تو اُس کی محویت ٹوٹی۔

آخری مچھلی پھنس چکی تھی۔ اُس نے تار لپیٹ لی۔ مچھلی تھیلے میں ڈالی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کپڑے جھاڑے۔ سامان اٹھایا اور— پانی کے کنارے سے اوپر آنے لگا۔

وہیں اوپر تلے واقع بہت سارے کچے پکے گھروندے تھے۔ اُن میں سے اٹھتے شام کی پکوان کے دھوئیں اُسے مسحور کرنے لگے۔ کتنی قریب تھی یہاں ہر چیز نیچر کے!

اپنی ننھی منی سی بھیڑوں کو ہانکتا مُنا سا ہی گڈریا پاس آ رہا تھا۔ وہ رک گیا۔ اُس سے باتیں کرنے لگا۔ اِدھر کی، اُدھر کی۔ پھر — سات آٹھ پکڑی مچھلیوں کا تھیلا اُسے پکڑایا۔

''گھر لے جا کر پکالو۔ ٹھیک ہے''۔ اُس نے اُس کا معصوم سا چہرہ پیار سے تھپتھپایا۔

اُس کی آنکھیں خوشی سے دمک اٹھیں۔

''اچھا صاحب''۔ وہ بولا۔ اور —

گھروندوں کی طرف ہولیا۔

سوچوں میں گم زارا اوپر بڑھ رہا تھا۔

تبھی — اُنہی گھروندوں میں سے نکلتی اُسے ہیزل نظر آ گئی۔

گہرے فیروزی رنگ کی جینز پر آف وائیٹ چھوٹی سی ایمبرائیڈرڈ شرٹ اور میچنگ سٹول کندھے پر لئے وہ بہت کیوٹ لگ رہی تھی۔ وہ اوپر اُسی کی سمت ہی آ رہی تھی۔

''گڈ ایوننگ میَم''۔ اس کے پاس آنے پر وہ خوشگواری سے بولا۔

''ایوننگ''۔ وہ دھیرے سے بولی۔

دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

''آپ... شاید فشنگ کرنے آئے تھے؟'' اُس کے کندھے سے لٹکا فشنگ راڈ دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔

''جی''۔ وہ اتنے مؤدب طریق سے بولا کہ —

وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دی۔

''اِس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے؟''

بات تو تھی۔ کہ آج پہلی بار اُس نے اُس کی ادب کی تھی۔ ورنہ تو — اوہ — وہ اِس وقت بھی ہڑبڑا سی گئی۔ پہلی پہلی بار جب اُس نے گاڑی میں باتوں باتوں میں اُسے 'آپ کتنی بیوقوف ہیں' کہا تھا۔ تو اُسکی آنکھیں حیرت سے پھیل پھیل گئی تھیں۔ پھر جب اُس دن ٹرین میں 'آپ کو باہر پھینک دوں گا ٹرین سے' کہا تھا۔ تو وہ چکرا کر رہ گئی تھی!

''ہاں۔ ہنسنے والی بات تو نہیں ہے لیکن ... پتہ نہیں کیوں ہنسی آ گئی۔'' وہ پھر ہنسنے لگی۔ ساتھ ہی —

پاؤں لڑکھڑایا اور — پیچھے کی طرف جُھول گئی۔

زارا نے فوراً تھام نہ لیا ہوتا۔ تو جانے کہاں تک اور کس حال میں نیچے پہنچتی؟

اُس نے اُسے سیدھا کھڑا کیا۔ ایک نظر غور سے اُس کے سراپے پر ڈالی۔

''آپ کی کمر اتنی پتلی ہے۔ پتہ نہیں کیسے آپ کو سنبھالے ہوئے ہے۔ Your—Majesty.'' اُس نے اُسکی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے کہا۔ بازو اب بھی اُس کی کمر کو حصار میں لئے تھا۔

وہ 'ادب' سے 'Your Majesty' پر آ گیا تھا۔ مگر — وہ سہار نہ سکی۔ آہستہ سے اُس کا بازو ہٹا دیا۔ چپ چپ سی آگے بڑھنے لگی۔

''میم صاحب جی''۔ وہ اُس کے قدم کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے پھر بولا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسکرا دی۔ اب کے اُس نے اُسے بالکل اُسکے مزارعوں کے انداز میں مخاطب کیا تھا!

''میَم''۔ اُس نے ایک بار پھر کہا۔

''جی''۔اُس نے بھی خود کو سنبھال لیا۔

''آپ — اِن گھروندوں میں کیا کر رہی تھیں؟''

''یہ لوگ ہمارے مزارعے ہیں۔ اِن کا حال احوال پوچھنے میں آتی رہتی ہوں...''

''اوہ — اِس کا مطلب ہے میں پھر مارا گیا''۔

''جناب''۔وہ خوبصورتی سے مسکرادی۔''آپ نے ایک بار پھر میرا بارڈر کراس کیا ہے''۔

''آپ — اپنے بارڈر پر کوئی حد بندی وغیرہ کیوں نہیں کر دیتیں''۔وہ کچھ بے بس سی اور بہت مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

اور — اُس کے انداز پر، لب و لہجے پر وہ بے ساختہ ہنس دی۔

''آپ کو اچھی طرح پتہ ہے۔کہ میرے علاقے کی با قاعدہ حد بندی ہوئی ہوئی ہے۔اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ ہر بار اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ حد بندی پھلانگ لیتے ہیں۔اب...''

اُس کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

واقعی ایسا ہی تھا۔مضبوط barbed wire سے با قاعدہ حد بندی ہوئی ہوئی تھی۔اور وہ واقعی ہر بار اُصول توڑ کر اندر آ گھستا تھا!

''سوری مَیم۔آئندہ ایسا نہیں ہوگا''۔وہ سنجیدگی سے بولا۔

وہ چونکتے ہوئے اُسے دیکھنے لگی۔وہ شاذ ہی سنجیدہ ہوتا تھا!

''اچھا چھوڑیں۔بتائیں کچھ فشنگ ہوئی بھی یا نہیں؟''

''خاک فشنگ ہوتی۔سر پر حکم عدولی کی تلوار سوار تھی۔بورڈ پر الگ لکھا تھا۔'یہاں

مچھلیاں پکڑنا منع ہے'۔یہی خوف کہ اب پکڑا گیا کہ اب...''

اُس نے گہری سی سانس لی۔

''تو... میرے خوف سے آپ مچھلیاں نہ پکڑ سکے''۔

''پکڑی تھیں''۔گڈریے کو دیدیں''۔وہ ناراض سا بولا۔

''لیکن آپ کہہ رہے تھے آپ کو حکم عدولی کا...''

''تو اِسی لئے تو گڈریے کو دیدیں''۔

''اور اس طرح آپ کی حکم عدولی معاف ہوگئی؟''

''ہاں''۔

''خود کو خود ہی معاف کر دیا؟''وہ مصنوعی حیرانگی سے بولی۔

''تو کیا آپ کو ایپلیکیشن لکھتا کہ مجھے معاف کر دیں۔مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔آئندہ ایسا نہیں ہوگا''۔اب کے لہجے میں بڑا رعب تھا۔

وہ ہولے سے مسکرادی۔وہ اُس سے نہیں جیت سکتی تھی!

تھوڑی دیر دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

''By the way, what is the measurement of your waist?''

بہت پرسنل سوال تھا۔لیکن وہ تھا ہی ایسا!

''یہاں waist کا کیا ذکر آ گیا؟''

''بہت پتلی ہے نا''۔

''تو آپ کیوں فکر مند ہو رہے ہیں؟''

''واقعی۔مجھے کیا؟''

دونوں پھر آگے بڑھنے لگے۔

''ویسے —خیال رکھیئے گا۔قد لمبا، کمر نازک۔کچھ ہوگیا تو...'' اب وہ اُسے باقاعدہ چھیڑ رہا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ اِسی قد کو آج تک سہارے ہوئے ہے۔آئندہ بھی وزن اٹھالے گی''۔

''میں پریشان نہیں ہوں گا۔تو کون پریشان ہوگا۔''

اُس کی آواز میں Concern سی تھی۔غیر اِرادی طور پر اُس نے رخ زار کی طرف کرلیا۔

وہ اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بڑی بڑی سٹون گرے آنکھیں اُس پر جمی تھیں۔ Concern تھی اُن میں۔کیئر بھی۔

اَپ سیٹ سی وہ سامنے دیکھنے لگی۔

وہ مسکرادیا۔دھیرے سے۔

وہ دونوں چوٹی پر پہنچ چکے تھے۔دائیں طرف کچھ فاصلے پر اُس کا کاسل تھا اور نیچے سڑک پر زار نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی۔

''چلیں۔میں آپ کو چھوڑ آؤں''۔

''نو تھینکس۔میں چلی جاؤں گی''۔

''میں چھوڑ آتا ہوں نا''۔اُس نے پھر کہا۔

''میں چلی جاؤں گی''۔

''ضد نہیں کرتے۔آئیں۔'' اُسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے وہ دائیں طرف ہو لیا۔

اُس کے لہجے میں اپنائیت سی تھی۔بالکل یوں بول رہا تھا۔جیسے وہ اُس سے چھوٹی تھی۔اور وہ اُسے اُس کے گھر چھوڑنے کا پابند تھا!

وہ بھی ساتھ ہولی۔پتہ نہیں کیا بات تھی؟ وہ اُسے دوست سا لگنے لگا تھا۔ساتھی سا۔جس پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔اعتماد کیا جاسکتا تھا!

چند قدم آگے چل کر اُس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے نکال لیا۔

ایک بار پھر—وہ مسکرایا۔ہولے سے۔

وہ کاسل سے باہر ہی رک گئی۔

''اب میں چلی جاؤں گی۔تھینک یو سو مچ''

''بائے''۔زار نے کہا۔

''بائے'' وہ بھی بولی اور—

کاسل کی دیوار کے ساتھ ساتھ گھومتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔

کل ہی اُس نے آبادی سے کافی پَرے دریا کنارے ایک پک نک سپاٹ دیکھا تھا۔ جا بجا شیڈز بنے تھے۔ ہر شیڈ کے ساتھ ایک بار بی کیو سٹینڈ اور ٹیبل تھی۔ ڈسٹ بنز تھے۔ کچھ فاصلے پر ٹوئیلٹس اور کار پارکنگ بھی تھی۔

اُس نے بازار سے چکنز اور بار بی کیو کا تمام سامان لیا۔ ڈسپوزیبل پلیٹس، کپس اور دیگر چیزیں خریدیں۔ سب کچھ گاڑی کے بُوٹ میں رکھا۔ اور — واپس آنے لگا۔

اپنا ہوٹیل، کوفی شوپ، پھر اپنا فیورٹ ریسٹورانٹ پیچھے چھوڑتا وہ آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ نظروں ہی نظروں میں ہیزل کو بھی کھوجتا ہوا آ رہا تھا۔ پر —

وہ اُسے کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ آج شاید گھر سے باہر ہی نہیں نکلی تھی۔ وہ اُس کے گھر کو بھی پیچھے چھوڑ آیا۔ مایوس سا آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ کہ —

اچانک ویو مرر میں سے وہ اُسے پیچھے سے آتی دکھائی دی۔ پھر وہ وہیں بائیں جانب چراگاہوں کے بیچ بنی کچی روڈ پر مڑ گئی۔

تبھی — وہی اُس دن والا شخص جس کے ساتھ وہ ٹرین میں گئی تھی، گاڑی چلاتا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ وہ بھی اُسی سمت مڑ گیا۔ جس طرف ہیزل گئی تھی۔

زاراب بھی اپنی راہ چلا جا رہا تھا۔ پھر — تھوڑی دیر بعد واپس مڑ آیا۔ چراگاہ کی طرف والی کچی روڈ پر نظر ڈالی۔ ہیزل کے ساتھ ساتھ اُس آدمی کی بھی گاڑی کھڑی تھی۔ دونوں وہیں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

پتہ نہیں کیوں؟ اُسے اچھا نہیں لگا۔ ساری ایکسائیٹمنٹ جاتی رہی تھی جیسے۔ پھر بھی — وہ آہستہ آہستہ آگے جانے لگا۔

سائیڈ مرر میں سے اُس نے دیکھا۔ جلدی ہی دونوں اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھے تھے۔ آدمی تو جانے کس طرف گیا۔ پر ہیزل واپس آنے لگی تھی۔

اُس کی گاڑی قریب آ گئی۔ تو وہ لفٹ سائیڈ پر رک گیا۔ موڈ اگرچہ اب بھی ٹھیک نہیں تھا!

اُسے کھڑے دیکھ کر اُس نے بھی گاڑی روک لی۔

باہر نکلتے ہوئے وہ اُس کے پاس چلا آیا۔

"گڈ مورننگ میَم"۔ سر قدرے خم کر کے اُسے سَن گلاسز کے اوپر سے بغور دیکھتے ہوئے اُس نے آہستہ سے کہا۔

سفید ٹراوَزرز، چوڑے گلے والی فلفی بے بی پنک وولن شرٹ پر بڑے سے سفید

بکل والی چوڑی بیلٹ، کلائی میں سفید ووڈن بریسلٹ، نازک پاؤں میں سفید فلیٹ سینڈلز اور — ٹائیٹ اونچی پونی ٹیل!

وہ بہت سمارٹ لگ رہی تھی۔ وہ چند لمحے پہلے کا واقعہ بھول بھال گیا جیسے!

''ہائے''۔ وہ بولی۔

''کہاں جا رہی ہیں؟''

''گھر''۔ اُس نے مختصراً کہا۔

''اتنی جلدی گھر جا کر کیا کریں گی؟'' ابھی تو گیارہ بھی نہیں بجے تھے!

''میرے بہت کام ہوتے ہیں گھر میں۔''

''مجھے پتہ ہے کیا کام ہوتے ہیں''۔

وہ مسکرا دی۔

''اچھا کیا کام ہوتے ہیں؟''

''یہی کہ — کبھی کسی فرینڈ سے فون پر بہت ساری باتیں کرتی ہوں گی۔ کبھی کوئی سنیک کھا رہی ہوں گی۔ یا پھر کسی نوکر پر رعب ڈالتی ہوں گی...''

وہ بے اختیار ہنس دی۔

''نہ میں کسی فرینڈ کے ساتھ بہت ساری باتیں کرتی ہوں۔ نا ہی میں کسی نوکر پر رعب ڈالتی ہوں...''

''اچھا سنیک تو کھاتی ہیں نا؟''

''ہاں''۔ وہ پھر مسکرا دی۔

''تو چلیں۔ باربی کیو بناتے ہیں۔ دریا کنارے پک نک مناتے ہیں آج''۔

''میں؟ پک نک؟ آپ کے ساتھ؟'' حیرت کے ساتھ ساتھ وہ جیسے اُس کی

بات میں دلچسپی بھی لے رہی تھی۔

''ہاں۔ پک نک، اور میرے ساتھ''۔

سٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ رکھے نظریں سامنے سڑک پر جماتے ہوئے اُس نے گہری سی سانس لی۔

''ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں ہیں ...''

''تو یہ کون سی مشکل بات ہے۔ آپ مجھے اپنا نام بتا دیں۔ میں آپ کو اپنا نام بتا دیتا ہوں۔ ''I am Czar. And you are ...

''Hazel.''

''اچھا نام ہے۔ اور آج سے ہم دونوں دوست ہوئے ...''

وہ مسکرا دی۔

''اتفاقاً بار بار مل جانے کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہم دوست بن گئے''۔

''آج شاید ہم اتفاقاً نہیں ملے''۔

''پھر؟''

''میں کافی دیر سے آپ ہی کو ڈھونڈ رہا تھا''۔

''اور میں مل گئی؟'' وہ سادگی سے بولی۔

''ہاں۔'' وہ غور سے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

آج پھر اُس کی 'ہاں' میں سادگی نہیں تھی۔ معنی تھی!

وہ پھر سٹپٹا سی گئی۔

''دراصل... آج مجھے ضروری کام ہے...'' اُس نے بات بنائی۔

وہ اُسے سمجھانا تو چاہ رہی تھی۔ کہ وہ اُس کے ساتھ مزید فری نہیں ہو سکتی تھی۔ مگر وہ

تو جیسے سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

''پلیز!'' وہ سراپا التجا تھا۔

''آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں''۔ وہ الجھ سی گئی۔

اُسے بھی اچھا لگتا تھا۔ کہ باہر کی دنیا سے رشتہ جوڑ لے۔ کوئی اُس کا بھی دوست ہو۔ ہمنوا، ہمدم!

مگر— یہ سب سوچنا— اُس کے لئے شاید ایک خواب ہی تھا!

''آؤ— پلیز!'' التجا کے ساتھ اپنا پن بھی تھا۔ 'آؤ' سے مخاطب کر رہا تھا اُسے!

اُس نے ایک اور تھکی سانس لی۔ ساتھ ہی مسکراتے ہوئے گاڑی سٹارٹ کی اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

وہ بھی پیچھے چلا۔ اُس نے بھی جیسے آج اُسے ساتھ لے جانے کی ٹھان ہی لی تھی۔

لمحوں میں ہی اُس سے آگے نکل گیا۔ گاڑی موڑتے ہوئے اُس کے بالکل سامنے کھڑی کر کے راستہ روک لیا۔

مجبوراً اُسے رکنا پڑا۔ بائیں طرف گاڑی کھڑی کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

''آپ... پلیز مجھے راستہ دیں گے۔ کہ میں آگے جا سکوں؟'' پاس آتے ہوئے وہ بہت مصالحت سے بولی۔

''نو''۔ اُس کا سمپل سا جواب تھا۔

''آپ کیوں ضد کر رہے ہیں''۔

''میں ضد نہیں کر رہا''۔

''تو پھر کیا ہے یہ سب؟''

''تم گاڑی میں بیٹھو''۔ دور سے ایک کار آتی دکھائی دی تو اُس نے کہا۔

وہ واقعی اپنی گاڑی میں جا بیٹھی۔ زار نے بھی راستہ کھول دیا۔

کار تیزی سے اُن کے پاس سے گزر گئی۔

زار نے گاڑی واپس موڑ لی۔

''Now, no arguments.'' وہ اُس کے پاس سے گزرتے گزرتے بولا۔ ''چلو۔ جہاں میں جاؤں''۔

واہ— عجیب زبردستی تھی!

پتہ نہیں کیسے؟ وہ واقعی اُس کے پیچھے پیچھے جانے لگی۔

جگہ خاصے فاصلے پر تھی۔ دونوں چلتے گئے۔ ہیزل کو بھی پتہ تھا پک نک سپاٹ کا۔ بارہا دل بھی چاہا تھا آنے کو۔ پر— کس کے ساتھ آتی؟

وہاں پہنچے۔ تو دونوں نے گاڑیاں پارکنگ میں کھڑی کر دیں۔

زار نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ چھٹیاں تھیں۔ اور بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ اُسے ایک سائیڈ پر خالی شیڈ نظر آیا۔ گاڑی سے سامان نکالا۔ اور ہیزل کو لئے وہاں جا پہنچا۔

زار نے سامان میں سے ایک چھوٹا سا rug نکال کر ایک طرف گھاس پر بچھا دیا۔

''تم یہاں بیٹھو میم صاحب''۔ اُسے ہاتھ سے تھامتے ہوئے وہ وہاں لے آیا۔

آج وہ اُسے 'تم' کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

زار نے ایک برتن میں چکنز نکالے۔ اُن پر مختلف چیزیں ڈال کر میرینیٹ کر کے ایک طرف رکھا۔ پھر— باربی کیو سٹینڈ پر آ کر کوئلے جلانے لگا۔

وہ دلچسپی سے اُسے کام کرتے دیکھ رہی تھی۔ عجیب مانوس اجنبی تھا۔ اَن جانا سا، پھر بھی جانا پہچانا سا۔ زبردستی سب کروا رہا تھا اُس سے۔ مگر ایسی زبردستی— کہ اُسے

بُرا بھی نہیں لگ رہا تھا!

تیس بتیس سال کا بہت ہینڈسم آدمی تھا وہ۔ چوڑے شانے، لمبا قد تھا۔ تانبے کی سی رنگت، پرکشش نقوش تھے اور — ستون گرے آنکھیں ہر پل بولتی رہتی تھیں!

بیج کلر پینٹس اور ڈارک گرین سویٹر میں وہ بہت ڈیشنگ لگ رہا تھا۔

پر — کون تھا وہ؟ عجیب زور آور آدمی تھا۔ جان نہ پہچان — اُسے یہاں تک لے آیا تھا!

وہ سارا کام خود کر رہا تھا۔ اب چکن پیسز سیخوں میں پرو کر جلتے کوئلوں پر الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ ساتھ میں گتے کے ٹکڑے سے آگ بھی تیز کرتا جا رہا تھا۔

وہ اٹھ کر پاس آ گئی۔

''میں کچھ ہیلپ کروں؟''

''بڑی جلدی خیال آیا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''اوہ۔ تو آپ مجھے کہہ دیتے''۔

''یہ لو''۔ اُس نے اُسے سیخ پکڑائے۔ ''میں میز لگا دیتا ہوں''۔

وہ کوشش کرنے لگی۔ مگر سیخ الٹ پلٹ کرنا اور ساتھ ہی آگ بھی تیز کرنا نہیں ہو پا رہا تھا۔ گھر میں کبھی کوئی کام جو نہیں کیا تھا۔

زارگا ہے گاہے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی سٹ پٹاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اُسے اندازہ تھا وہ مشکل کام کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اِسی لئے تو کہا نہیں تھا اُسے۔

اُس نے پیپر پلیٹس، کپس، کیچپ، پیپسی وغیرہ نکال کر میز پر رکھے۔

پھر — اُس کے قریب آ گیا۔ چکن پروئے سیخ اُس سے لے لئے۔

''تم صرف آگ بجھنے مت دو ٹھیک؟'' وہ مسکراتے ہوئے اپنائیت سے بولا۔

''ٹھیک ہے''۔ اُس نے ہاتھ میں گتہ تھام لیا۔

''پہلے کبھی کام کیا ہے؟'' وہ کام پر نظریں جمائے جمائے بولا۔

''کام کیا ہے۔ باربی کیو نہیں بنایا''۔

''دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد کوفی تم بنانا''۔

''ٹھیک ہے''۔ وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

اُسے اُس کی گفتگو کا انداز اچھا لگ رہا تھا۔ اپنائیت تھی اُس میں، رعب بھی تھا، بوس پن بھی تھا!

سب تیار ہوا۔ تو وہ گرم گرم باربی کیو ٹیبل پر لے آیا۔

کیچپ اور پیپسی کے ساتھ باربی کیو کا مزا دوبالا ہو گیا۔

کھانے کے بعد ہاتھ ٹشو سے صاف کرتے ہوئے وہ پاس ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

''اب تمہاری باری ہے کوفی بنانے کی''۔

''اوہ''۔ اُسے یاد آ گیا۔

اُس نے سامان میں سے کوفی، شوگر وغیرہ نکالا۔

''مگر — پانی کیسے بوائل ہوگا؟''

''ہاں — اب خیال آیا نا۔ اُس وقت تو بڑے مزے سے کہا تھا۔ 'ٹھیک ہے'۔''

اُس نے اُس کی 'ٹھیک ہے' بالکل اُسی کے انداز میں کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ٹھیک تو ہے لیکن۔ پانی کس طرح بوائل ہوگا''؟ اُس نے پھر دہرایا۔

''اِنہی کوئلوں پر''۔ اُس نے باربی کیو سٹینڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو—پتہ نہیں کیسے ہوگا؟''

''مجھے کوئلے جلاتے دیکھا تھا نا۔بس اُسی طرح کوئلے گرم کرو۔اور سامان میں ایک سٹیل کا بول ہے اُس میں پانی آگ پر رکھدو۔اُبل جائے گا''۔

''آپ...بہت...You cruel man''وہ بڑبڑائی۔

آہستہ آہستہ باربی کیو سٹینڈ کی طرف بڑھی۔کوئلے اکٹھے کئے۔اور —ماچس کی تیلی جلا کر پاس لے گئی۔

کچھ نہیں ہوا۔تیلی جل کر ختم ہوگئی۔دوسری جلائی۔وہ بھی بجھ گئی۔

''میم صاحب۔مٹی کا تیل ڈالو کوئلوں پر''۔اُس نے وہیں سے کہا۔

''اوہ''۔واقعی تیل کے بغیر کیسے کوئلوں کو آگ لگتی؟

اُس نے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔چھڑکنے کو ہی تھی۔کہ وہ پاس آ گیا۔

''رہنے دو''۔اُس نے اُس کے ہاتھ سے بوتل واپس رکھ دی۔''میں تو تمہیں تنگ کر رہا تھا۔میری گاڑی میں کیتل ہے۔اُس میں پانی اُبال لیں گے آؤ۔''اُس نے بہت اپنائیت سے اُس کا ہاتھ تھاما۔

''آپ بہت ظالم ہیں''۔وہ دھیرے سے بولی۔

''سوری۔لیکن — تمہیں کام کرتے دیکھ کر مجھے اچھا لگ رہا تھا''۔اُسے ساتھ ساتھ لئے وہ گاڑی کی طرف جانے لگا۔

اُسے پسنجر سیٹ پر بٹھایا۔خود ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔گلوبوکس میں سے چھوٹا سا الیکٹرک کیتل نکالا۔پانی ڈالا۔پلگ لگایا۔اور اُبلنے کا انتظار کرنے لگا۔

''میم''۔ایک سرسری نظر اُس پر ڈالتے ہوئے وہ گویا ہوا۔''تم نے جو یہ چوڑا گلا پہنا ہے نا۔کسی کیڑے ویڑے نے کاٹ لیا۔تو مجھے مت کہنا۔''

''اوہ''وہ سرخ سی ہوگئی۔اُس کا مطلب بھی سمجھ گئی۔''آپ کو شاید میرا ڈریس اچھا نہیں لگا...''

''کون کافر کہتا ہے کہ اچھا نہیں لگا''۔اُس کے لہجے میں شرارت تھی۔''اِسی لئے تو کہتا ہوں۔covered رہو تو زیادہ اچھا ہے''۔

پانی کیتل میں اُبلنے لگا تھا۔وہ فوراً اُس کی طرف متوجہ ہوگیا۔اور—

ہیزل ہولے سے مسکرا دی۔کتنے نرالے انداز میں اُس نے اُسے اپنا message convey کیا تھا۔اُسے کورڈ ڈریس اچھے لگتے تھے!

کیتل میں کھولتا پانی لئے وہ دونوں واپس شیڈ میں آ گئے۔

پہلے اُس نے ہیزل کے لئے کوفی بنائی۔کوفی میں اُس کی مرضی کے ساتھ دودھ اور چینی ملا کر اُسے کپ تھمایا۔اپنے لئے کپ میں کوفی ڈال کر اوپر سے ابلا پانی ڈالا۔چمچ چلایا۔اور گرم گرم کڑوے کڑوے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

''آپ تو بلیک کوفی پیتے ہیں۔پھر یہ دودھ،شوگر...؟''وہ کچھ تحیر سے بولی۔

''تمہارے لئے لایا تھا''۔

''آپ کو یقین تھا کہ میں آپ کے ساتھ آؤں گی؟''اُسے اب بھی حیرت ہو رہی تھی۔

"Yes - more than that."

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔سامنے پکنک مناتی ایک فیملی کو دیکھتے دیکھتے اپنی کوفی پینے لگی۔

''تمہارا نام تمہاری آنکھوں کے رنگ کی وجہ سے رکھا گیا ہوگا؟''کچھ سوچتی کچھ کھوجتی اُس کی خوبصورت سرخی مائل زرین آنکھوں کو دیکھتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

"ہاں"۔ اُس نے مختصراً کہا۔ یہ نام اُس کے پاپا نے رکھا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اُس کے لب و لہجے میں اُداسی سی عود کر آئی تھی۔

"وہ۔۔۔ دیکھو۔ اُس بچے کی طرف"۔ زار نے فوراً اُس کا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔ "کتنی مستی کر رہا ہے"۔

اُس نے دیکھا۔ دور ساحل پر ایک چار پانچ سال بچہ اپنے کتے کے ساتھ ہنستا کھیلتا ریت میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

وہ بھی ہنس دی۔

"اِسی طرح ہنستی رہا کرو۔ تمہارا ڈِمپل اور بھی پیارا لگنے لگتا ہے"۔

وہ۔۔۔ چونک سی گئی۔ بہت۔۔۔ بہت دیر بعد جیسے ہوش آیا۔ وہ کہاں تھی؟ کس کے ساتھ تھی؟

"اب چلنا چاہیئے"۔ وہ اچانک بولی۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" وہ اُس کی اچانک تبدیلی پر کچھ حیران سا ہوا۔

"کچھ نہیں۔ میں گھر جاؤں گی"۔

"او کے۔ کوفی تو ختم کر لو"۔

"ختم ہو گئی"۔ اُس نے عجلت سے آخری گھونٹ لیا۔ کپ واپس میز پر رکھا۔

زار تمام استعمال کیئے ہوئے ڈسپوزیبل برتن لیکر ڈسٹ بن کی طرف چلا۔ اور ہیزل نے باقی چیزیں سمیٹ لیں۔

جانے کیوں؟ اب زار بھی جلدی کر رہا تھا۔ شاید اُسے بھی خیال آ گیا تھا۔ کہ اب چلنا چاہیئے تھا کہ۔۔۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ اور اُسے بہت سارا وقت دے چکی تھی!

دونوں اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے۔ وہ آگے اور زار پیچھے جانے لگا۔

ہیزل کا گھر آ گیا۔ تو وہ اُس طرف مڑ گئی۔ زار سیدھا نکلتے ہوئے اپنے ہوٹیل کی طرف جانے لگا۔

اُس کے بعد وہ اُسے کہیں نظر نہیں آئی۔ صبح شام وہ بار ہا اُس کی تلاش میں نکلا۔

مگر — وہ نہیں ملی۔

وہ سمجھ رہا تھا۔ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی تھی۔ پک نک پر تو اُس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ انجوائے بھی کیا تھا سب۔ مگر آخری لمحوں میں اُسے جیسے اچانک احساس ہو گیا تھا۔ کہ وہ اُس کے ساتھ آ کر صحیح نہیں کر رہی تھی۔ گرچہ چند روز قبل شام بارش میں اُسے اپنی گاڑی میں ہوٹل تک بھی لے آئی تھی۔ اُس کے بعد ٹرین میں بھی اُس کے ساتھ سفر کرتی رہی تھی۔ مگر یہ سب اُس کی دانست میں اتفاقاً ہو رہا تھا۔ اِس لئے وہ مطمئن تھی۔

اور — تین دن پہلے جب اُس کے ساتھ پک نک پر گئی تھی۔ چونکہ خود گئی تھی، اتفاق نہیں تھا۔ اِس لئے گلٹی فیل کرنے لگی تھی۔ گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی تو اُسے —

ہر بار آ لیتا تھا۔ بات کئے بغیر بلکہ — ساتھ دیئے بغیر جانے نہیں دیتا تھا۔

مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ ہی اُس نے گہری سانس لی۔ پانی کیتلی میں اُبل رہا تھا۔ اُس نے سوئچ آف کیا۔ اور کپ میں ٹی بیگ، شوگر کیوب اور پاؤڈرڈ مِلک کے اوپر کھولتا ہوا پانی انڈیل دیا۔ چمچ چلاتا وہ اپنے بیڈروم میں آیا۔ اور پھر بالکنی میں۔

ڈھلان کی بے تحاشہ ہریالیاں۔ سوئیس کی سرخ ڈھلانی چھتیں، ناگن سی بل کھاتی سڑک، فسوں گر چراگاہیں اور — دُور اُس پار نیلگوں پانیاں ڈوبتے سورج کی نارنجی لَو اوڑھے تھیں۔

وہیں دروازے کے پٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے وہ گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پینے لگا۔

ذہن پر اِس وقت بھی ہیزل چھائی ہوئی تھی۔ کھیل کھیل میں ہی، مذاق مذاق میں ہی — وہ شاید اُسے پسند کرنے لگا تھا۔ بلکہ — شاید بھی نہیں — حقیقتاً وہ اُسے اچھی لگنے لگی تھی۔

اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو وہ یہ تین دن اُس کی عدم موجودگی محسوس نہ کرتا۔ محسوس تو کیا۔ وہ تو ٹھیک ٹھاک بیقرار سا تھا، بے کل سا!

باقاعدہ اُسے تلاش کرنے نکلتا تھا۔ اور نہ ملتی۔ تو گہری مایوسی کا احساس ہوتا تھا۔ اُداسی کا بھی!

چائے ختم کر کے اُس نے خالی کپ میز پر رکھا۔ کرسی پر بیٹھا۔ اور ٹانگیں سیدھی

پھیلاتے ہوئے اِردگرد کا لازوال حسن آنکھوں کے راستے من میں اتارنے لگا۔

شام اُترنے لگی تھی۔ سردی بڑھنے لگی تھی اور — دُور اُس پار پانی میں چلتی بارج نے اپنی بتیاں روشن کر لی تھیں۔

وہ اٹھا۔ اندر آیا۔ چابیاں اٹھائیں۔ سویٹ لاک کیا۔ نیچے آتے ہوئے ریسپشن کے راستے سے باہر آیا۔ کار پارکنگ میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور — سڑک پر بائیں جانب مڑتے ہوئے بے مقصد آگے بڑھنے لگا۔

اِس طرف ٹریفک بہت کم ہوتی تھی کہ — آبادی کافی پیچھے تھی۔ اِکاّ دُکا گھر تھے اِس جانب۔ یا پھر وہ کوفی شوپ اور وہ انوکھا سا ریسٹورانٹ تھا۔ اِسی اٹریکشن میں شاید اِس طرف لوگ آ جاتے تھے ورنہ آگے تو صرف سڑک ہی سڑک تھی۔ یا پھر بہت ہی حسین قدرتی مناظر!

چلتے چلتے وہ غیر ارادی طور پر کوفی شاپ کی طرف مڑا۔ گاڑی کھڑی کی۔ اور اندر چلا آیا۔ سخت سردی میں مدھم روشنیوں سے معمور کوزی سا کوفی شاپ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ چند باذوق لوگ پہلے سے بیٹھے کھانے پینے اور کوفی شاپ کے خواب آور ماحول سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

وہ بھی ایک کونے والی خالی ٹیبل پر آ بیٹھا۔ کوفی آرڈر کی اور — سرسری سی نظر ہال پر دوڑانے لگا۔

تبھی — وہ چونکا۔ سامنے ہی ایک ٹیبل پر ہیزل بیٹھی تھی۔ ساتھ میں ایک آدمی بھی تھا۔ دونوں کوفی پی رہے تھے۔ باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔

جانے کیوں؟ وہ بے چین سا ہوا، بیقرار سا!

اُس کی کوفی آئی۔ تو وہ مصروف ہو گیا۔ مگر — نظریں پھر بھی اُس طرف اٹھ ہی

جاتیں۔ آدمی بار بار ہیزل کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ گندی سی نظریں تھیں اُس کی۔ ہوس سی تھی اُن میں!

کون ہو سکتا تھا یہ آدمی؟ ہیزل تو آرام سے اُس کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ کیا کوئی بزنس پارٹنر تھا؟ کوئی رشتہ دار؟ یا پھر بوائے فرینڈ؟

اُس نے بے کلی سے پہلو بدلا۔ جو بھی تھا اچھا آدمی نہیں لگ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیسے کیسے لوگوں سے ملتی تھی؟ آدمی لگ بھگ چالیس کا تھا۔ عمر میں اُس سے دگنا تھا پر۔ بیس سال کی عمر میں لڑکی کو بھی کچھ تو عقل سے کام لینا چاہیئے تھا!

اُس کے نظروں کی تپش تھی شاید کہ — ہیزل کی نظریں اٹھیں اور — سیدھی زار پر پڑ گئیں۔

ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں شناسائی کے دیپ جل اٹھے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اُس آدمی کو دیکھنے لگی۔ باتیں کرنے لگی اُس سے۔ جیسے اُسے نہیں جانتی تھی۔ کوئی اجنبی تھا وہ!

اُسے غصہ سا آ گیا۔ اُس نے بارہا اُس کی آنکھوں میں اپنے لئے سپنے سے دیکھے تھے۔ longing دیکھی تھی۔ اُسے غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔ یقین تھا اُسے اِس بات کا!

جبھی تو غائب ہو گئی تھی۔ گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ کہ اُسے ڈر تھا کہ مزید اُسے ملی۔ تو اپنی آنکھوں کے راز پر قابو نہ پا سکے گی۔ پر —

وہ کیوں اَپ سیٹ ہو رہا تھا؟ اُس کی مرضی جس سے چاہے ملے۔ جس سے چاہے بات کرے!

اُس نے پے منٹ کی اور واپس ہوٹیل چلا آیا۔

کافی دیر لِونگ روم میں بیٹھا ضروری فیکس اور فون کرتا رہا۔ پھر بیڈ روم میں

آ گیا۔ صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے ٹی وی دیکھنے لگا۔ جانے کیوں اب بھی کچھ الجھا الجھا سا تھا۔ نظریں بے شک کہ ٹی وی پر تھیں۔ مگر ذہن بار بار کوفی شاپ میں بیٹھی ہیزل اور اُس آدمی کی طرف چلا جاتا۔ بار بار کچھ جھنجھلا سا بھی اٹھتا۔ کیوں سوچ رہا تھا وہ اُس کے بارے میں؟ خود کو پریشان کر رہا تھا۔

رات دس بجے کے قریب وہ ڈنر کے لئے نیچے ڈائیننگ ہال میں آ گیا۔ وہی پرسکون اور جیتا جاگتا ماحول تھا۔ مدھر پرفیومز اور قیمتی سگریٹس کی آپس میں مدغم ہوتی مہک تھی۔ صاف شفاف ٹیبلز، اُن پر سجی جدید ترین کراکری، کٹلری تھی۔ آرڈرز لیتے، سرو کرتے چاق و چوبند مؤدب بیرے تھے اور — لذیذ کھانے!

اُس نے بھی ویجیٹیبلز اور میشڈ پوٹیٹوز کے ساتھ سٹیک آرڈر کیا۔ خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا۔ اور — اوپر اپنے سویٹ میں آ گیا۔

رات کے کپڑے بدلے اور حسبِ معمول چند پل کے لئے بالکنی میں آ کھڑا ہوا۔

پورا چاند پورے ماحول کو اپنے سحر میں جکڑے تھا۔ ہری بھری ڈھلان، یہاں وہاں بکھرے سوئیس کی سرخ کھپریل کی چھتیں، بل کھاتی سیاہ سڑک اور تاحدِ نگاہ پاسچرز — سبھی تو چاندنی کے نور میں ڈوبے تھے!

گہری سانس لیتا وہ واپس بیڈروم میں آ گیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر ٹی وی دیکھنے لگا۔

تبھی — امی کا فون آ گیا۔ فکر ہو رہی تھی اُنہیں۔ ایک ہفتہ گزارنے کا کہا تھا اور تیسرا ہفتہ پورا ہو رہا تھا اُسے یہاں آئے۔

"بس امی — دو چار دن اور۔ کام ہوتے ہی آ جاؤں گا"۔

"لیکن تم نے تو کہا تھا چار پانچ دن کا کام ہے۔"

"بظاہر تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ مگر یہاں آ کر پتہ چلا کافی complicated کام ہے۔ اتنی جلدی ہونے والا نہیں"۔

"چلو۔ کوشش کرو جلدی نمٹانے کی۔ اداس ہو جاتے ہیں ہم لوگ تمہارے بغیر"۔

"آپ اور نانو بھی بہت یاد آتی ہیں امی۔ ساتھ لیکر آ سکتا تو ضرور لاتا۔ اتنی خوبصورت جگہ ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ ٹھنڈ اتنی ہے کہ جم جم جاتا ہے بندہ..."

"بیٹا اپنا خیال رکھنا۔ تم لاپروا بھی بہت ہو۔ پتہ نہیں کچھ گرم پہنتے بھی ہو یا نہیں"۔

وہ مسکرا دیا۔ وہ واقعی چور تھا خود کو سردی سے بچانے میں!

"مجبوراً پہننا پڑتا ہے۔ باہر نکلو تو سرد ہوا جسم کے آر پار ہوتی ہے..."

"اوہ۔ اور یہاں گرمی آر پار ہو رہی ہے جسم کے"۔

"نانو کیسی ہیں؟"

"لو بات کرو نانو سے"۔ جواب میں انہوں نے فون اپنی والدہ کو پکڑا دیا۔

"بیٹا خود کو گرم رکھو۔ ورنہ ناراض ہو جاؤں گی۔ اور... دودھ پیتے ہو رات کو یا نہیں؟"

اُس کی خوبصورت گھنی بھوئیں اوپر اٹھ گئیں۔ امی سے زیادہ نانو کو فکر ہوتی تھی اُس کی!

"نانو ناراض نہ ہوں۔ خود کو گرم رکھتا ہوں میں۔ اور — دودھ 'بھی'... پیتا ہوں"۔ 'بھی' پر زور دیتے ہوئے اُس نے خالص جھوٹ بولا۔

"جلدی کوشش کرو آنے کی"۔ وہ مزید بولیں۔

"جی نانو۔ بس جلدی ہی آ رہا ہوں"۔

''نادیہ بھی بہت یاد کرتی ہے''۔ یہ زار کی چھوٹی خالہ تھیں۔

''آئیں تھیں کیا؟''

''ہاں۔کل آئی تھی''۔

کچھ دیر نانو اور زار یوں ہی گپ شپ کرتے رہے۔ نانو ایک عرصہ سے اُن کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ اُسے اپنی نانو سے بہت پیار تھا۔

''اچھا بیٹا اپنا خیال رکھنا۔ اب بند کرتی ہوں''۔ نانو بولیں۔

''I love you Naano.'' وہ ہمیشہ کی طرح بولا۔

''I love you more than that.'' وہ بھی ہمیشہ کی طرح بولیں۔

اور —

فون بند ہوگیا۔

وہ اٹھا۔ ٹی وی اور لائیٹ آف کی۔ اور نرم و گرم بستر میں گھس گیا۔

دن بھر کا تھکا ماندہ سورج اپنی پناہ گاہ کی جانب رواں دواں تھا۔ وسیع و عریض پاسچرز، ہری بھری ڈھلانیں اور دریا کا لامتناہی پانی ڈھلتے سورج کا سیندور چرائے لئے جا رہے تھے۔

حسب معمول بالکنی میں کھڑا شام کی چائے پیتا وہ آس پاس پر سے قدرت کے انمول حسن کو اپنے من میں سمو رہا تھا۔

آج بھی دوبارہ وہ نیچے گیا تھا۔ جہاں جہاں ہیزل متوقع تھی۔ وہاں وہاں گھوم پھر آیا تھا۔ مگر — وہ نظر نہیں آئی تھی۔ شروع کے دن بہت اچھے تھے۔ جا بجا اُس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ اُس کی مرضی ہوتی نہ ہوتی وہ اُس سے باتیں کر لیتا تھا۔ اُس کے

ساتھ گھوم پھر لیتا تھا۔

اب بھی بہت کچھ کہنا تھا اُس سے۔ بہت کچھ سننا تھا اُس سے!

مگر — کیسے ملے اُس سے؟ کہاں ملے اُس سے؟ وہ گھر میں مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ اور اُس کے گھر — وہ جا نہیں سکتا تھا۔ بہت پہرے تھے وہاں۔ بڑی پابندیاں تھیں!

اُس نے گہری تھکی سانس لی۔ چائے کا آخری گھونٹ لیا۔ اور اندر کمرے میں آ گیا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے گاڑی کی چابی لی۔ اور ایک بار پھر ہیزل کو تلاش کرنے سویٹ سے باہر نکل آیا۔ سویٹ لاک کرنے ہی لگا تھا کہ نیچے دائیں والے سویٹ میں کچھ دنوں سے آئیں آنٹی کی آواز سے چونکا۔

نیچے ریسپشن یا ڈائننگ ہال آتے جاتے وہ اُن کے سویٹ کے پاس سے گزرتا تھا۔ کبھی کبھار سلام دعا بھی ہو جاتی تھی۔ مگر یوں بے تکلفی سے انہوں نے پہلے مخاطب نہیں کیا تھا۔

رخ اُن کی طرف کرتے ہوئے وہ سوالیہ انداز میں اُنہیں دیکھنے لگا۔

''بیٹا کہاں جا رہے ہو؟'' اُنہوں نے بالکل یوں کہا جیسے عرصے کی جان پہچان تھی۔

''مارکیٹ کی طرف''۔ اُس نے مختصراً کہا۔

''تو بیٹا ساتھ میں صدف کو بھی لے جاؤ۔ ہمارا ڈرائیور ضروری کام سے گیا ہے۔ گروسری ختم ہو گئی ہے ہماری...''

اوہ — اُسے عجیب سا بھی لگا۔ صدف اُن کی جوان بیٹی تھی۔ کیسا لگے گا؟ مگر — کرٹسی تو کرنا تھی!

''جی ٹھیک ہے''۔

صدف تیار تھی۔ ساتھ چل پڑی۔

نیچے پارکنگ میں پہنچ کر اُس نے اُس کے لئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئی۔ تو وہ بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

صدف بازار میں ایک سٹور سے چیزیں خرید رہی تھی۔ اور وہ گاڑی میں بیٹھا یوں ہی اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہیزل کو تلاش کرنے لگا۔ مگر — ہیزل ہوتی تو نظر آتی!

صدف کا کام جلدی ہی ختم ہو گیا۔ گاڑی کے پاس آنے لگی تو زارنے گاڑی سے باہر آتے ہوئے اُس کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ مگر اُس نے جو مختصر سی خریداری کی تھی اُسے سیٹ پر رکھا اور پسنجرز سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے آرام سے آگے بیٹھ گئی۔

جز بز سا ہوتا وہ پیچھے سے گھوم کر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ گاڑی سٹارٹ کی اور واپس جانے لگا۔

''آپ کو شاید اچھا نہیں لگا۔ کہ میں آپ کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی ہوں''۔ صدف کی آنکھیں اُس کے چہرے پر گڑی تھیں۔

''آں — نہیں تو''۔

''پھر آپ نے میرے لئے پچھلا دروازہ کیوں کھولا تھا؟''

''اوہ — لیکن پھر بھی آپ بیٹھیں تو نہیں''۔

''ہاں۔ مجھے پچھلی سیٹ کبھی اچھی نہیں لگی''۔

''I see.'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ یہاں سیزن گزارنے آئے ہیں؟''

''ہاں''۔

''پورا سیزن؟''

''نہیں''۔

''آپ... کیا کرتے ہیں؟''

''Nothing.''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے''۔

وہ خاموش رہا۔ سڑک پر نظریں جمائے رکھا۔ پتہ نہیں کیوں؟ اُس کا اُس کے ساتھ آنے کا مقصد اُسے کچھ بے مقصد سا لگا۔ جیسے اُسے کوئی خاص کام نہیں تھا مارکیٹ میں۔ جیسے یوں ہی چلی آئی تھی اُس کے ساتھ!

چند پل وہ بھی چپ رہی۔

''آپ بہت کم بولتے ہیں''۔ وہ پھر بولی۔

''اُمم م م— نہیں۔ اتنا کم بھی نہیں''۔ وہ واقعی 'بہت کم' نہیں بولتا تھا لیکن— ایک انجانی لڑکی کے ساتھ کتنا بولتا؟

''کیوں اتنا کم بولتے ہیں؟''

''کوشش کروں گا کہ زیادہ بولوں''۔

''اُس کی بات اُسے اچھی لگی۔ ہنس دی۔ کھلکھلا کر۔

وہ پھر خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگا۔

وہ بھی شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ لوگ بازار کی رونقیں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اب رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں وہاں گھروں میں روشن بتیاں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ سردی بھی سوا ہو گئی تھی۔

''آپ کو یہ علاقہ کیسا لگا؟''صدف نے پوچھا۔

''اچھا ہے''۔ جبکہ وہ اِس علاقے کی تعریف میں گھنٹوں بھی بات کرتا تو کم تھا!

''صرف اچھا ہے؟''

''ہاں۔ صرف اچھا ہے''۔ ایک مبہم سی مسکراہٹ اُس کے پُرکشش ہونٹوں کو چھو کر لوٹ گئی۔

''آپ کچھ بد ذوق سے نہیں ہیں''۔ وہ جیسے اُس کے رویے سے تنگ سی آ رہی تھی۔

''شاید''۔

''آپ لگتے تو ایسے نہیں ہیں''۔

غیر اِرادی طور پر اُس کا رخ اُس کی طرف ہو گیا۔ وہ اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔ نظروں میں بے باکی سی تھی۔

وہ پھر سے سامنے دیکھنے لگا۔ بولا کچھ نہیں۔

وہ بھی خاموشی سے باہر دیکھنے لگی۔

'Jade Hills Hotel' آ گیا تھا، اُس نے گاڑی سڑک پر ہی روک لی۔ کیونکہ اُس نے آگے جانا تھا۔ اور صدف کو بھی اب اُس کی ضرورت نہ تھی۔ کہ اُس کا سامان ہلکا پھلکا سا ہی تھا۔ خود اٹھا سکتی تھی۔

''آپ اُتر جائیں۔ میں آگے جاؤں گا''۔ اُس نے متانت سے کہا۔

''نہیں''۔ اچانک اُس نے اپنا ہاتھ اُس کے سٹیئرنگ وہیل پر رکھے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی''۔

اُس نے چونکتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔ کیا بے ہودہ حرکت تھی۔

"آپ پلیز اوپر چلیں۔ رات ہے۔ اچھی بات نہیں ہے۔"

"رات سے کیوں ڈر لگتا ہے؟" اُس کا ہاتھ اب بھی اُس کے ہاتھ پر تھا۔ آنکھیں عجیب سی زبان بول رہی تھیں۔

اُس نے اُس کا ہاتھ آہستہ سے ہٹا دیا۔ گاڑی سے باہر نکلا۔ پچھلی سیٹ سے اُس کا شوپنگ بیگ اٹھایا اور اُس کا دروازہ کھول دیا۔

"چلیں۔ پلیز!"

"نہ جاؤں تو؟" وہ اب بھی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ بے باک آنکھیں اُس کی آنکھوں میں گڑھی تھیں۔

"چلیں شاباش۔" اُس نے اُس کا لفافہ اُسے تھمایا۔

وہ بادلِ نخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"Thank you any way." وہیں کھڑے کھڑے وہ بولی۔

اور — زارا اپنی سیٹ پر آیا۔ اور گاڑی روانہ کر دی۔

اوہ — اُس نے نجات کی سانس لی۔ یہ کیسی لڑکی تھی؟ چمٹی جا رہی تھی خود بخود!

اُس نے سر جھٹکا۔ ہیزل کے بارے میں سوچنے لگا۔ کتنی اچھی تھی وہ۔ خود بھی، دل کی بھی!

خود مختار، بااختیار۔ اِس کے باوجود ہمبل سی، منکسر المزاج سی۔ بہت اعتماد کے ساتھ بہت خوبصورت باتیں کرتی تھی۔ حسِ مزاح تھا اُس میں۔ لیکن — چہرے پر سنجیدگی بلکہ اُداسی سی چھائی رہتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں؟

اُسی کے بارے میں سوچتا وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ راستے میں وہ کوئی شاپ بھی گیا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ چھوٹے سے ریسٹورانٹ میں جھانکا۔ وہاں بھی کوئی آثار

نہ تھے۔ وہ دُور اُسی راستے پر اُس کے گھر تک گیا۔ آس پاس گھوما پھرا۔ مگر — ہیزل ندارد تھی!

گہری مایوسی لئے وہ واپس 'Jade Hills Hotel' چلا آیا۔

ڈنر کے بعد وہ لِونگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ چند ضروری فون کالز کئے۔ اور پھر دیر تک انٹرنیٹ پر بزی رہا۔ تھک گیا تو — سب چھوڑ چھاڑ کچن جا کر اپنے لئے چائے بنائی اور بیڈ روم میں آ گیا۔ ٹی وی پر نظریں جمائے گرم گرم چائے کے گھونٹ حلق سے اتارتا رہا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ وہ اٹھا۔ ٹی وی آف کی۔ ڈریسنگ روم میں رات کے کپڑے بدلنے گیا ہی تھا کہ کسی نے زور زور سے سویٹ کا دروازہ پیٹا۔ کون ہو سکتا تھا رات کے اِس سمے؟ متحیر سا وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ کھولا۔ دیکھا۔

ہیزل کھڑی تھی۔ روتی ہوئی پریشان حال۔ ڈھلان چڑھنے کی وجہ سے سانسیں بے ترتیب۔

اندر آتے ہی بے اختیار اُس سے لپٹ گئی۔

"مجھے بچا لیں پلیز..." وہ ہذیانی انداز میں بول پڑی۔

"کیا ہوا ہیزل؟" اُس نے اپنے مضبوط بازو سے اُسے سہارا لیا۔

"زارا مجھے بچا لیں۔ پلیز بچا لیں۔" اُس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔

"حوصلہ کرو ہیزل"۔ وہ اُسے صوفے کی طرف لانے لگا۔ "یہاں بیٹھو"۔ اُسے بٹھایا۔ خود بھی ساتھ بیٹھ گیا۔ "اب بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

"وہ... آدمی نہیں تھا... کل جو میرے ساتھ تھا... کوئی شاپ میں..." تیزی سے ڈھلان چڑھی تھی۔ سانسیں اب بھی بے قابو ہو رہی تھیں۔

وہ چونکا۔ پھر بھی—

''تم ذرا دم لو پلیز''۔ اُس نے اُس کے بکھرے بال سہلائے۔ اپنائیت سے انگلیوں کی پوروں سے اُس کے آنسو پونچھنے لگا۔

اور—وہ بے اختیار رونے لگی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اُس نے اُس کا سر اپنے پہلو سے لگا لیا۔ تسلی دینے لگا۔ چپ کرانے لگا۔ مگر—

وہ اور بھی رو دی۔ اُس سے لپٹ لپٹ کر رو دی۔

اور—اُس نے بھی اُسے لپٹا لیا۔ ہونٹ بے اختیار اُس کے ماتھے پر ٹِک گئے۔

کہ—وہ جو اُسے دنوں سے بے تحاشا کھوج رہا تھا۔ آج خود چل کر اُس کے پہلو میں آ گئی تھی۔ پیار تو آنا تھا اُس پر!

پھر—اُسے چپ چاپ رونے دیا۔ کہ اچھا تھا دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔

دل کی بھڑاس نکال چکی۔ تو زار نے ایک بار پھر اُس کے آنسو پونچھے۔ پھر اٹھا اور گلاس میں پانی لا کر اُسے پلایا۔ اب وہ قدرے اِس قابل ہو گئی تھی کہ بات کر سکے۔

''وہ آدمی میرے بیڈ روم میں آ گیا تھا۔ ڈرنک تھا۔ مجھے زبردستی پکڑنا چاہا۔ میں کمرے سے بھاگ نکلی۔ تو وہ میرا پیچھا کرنے لگا۔ میں نے نوکروں کو آواز دی۔ تو اُس نے کہا۔ اُس نے تمام نوکروں کی رات بھر کو چھٹی کر دی ہے۔ بس اللہ۔ نے مجھے ہمت دی۔ ڈائننگ روم کی کھڑکی سے چھلانگ لگائی اور یہاں چلی آئی...''

ایک جان پہچان کا شخص اِس قدر گر سکتا ہے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ انسان نہیں یہ تو حیوان تھا!

''لیکن وہ تمہارے گھر آیا کیسے؟ وہاں تو بے شمار پہرے ہیں''۔ وہ دیکھ تو چکا تھا اُس کے گھر کے اِرد گرد پہروں پر پہرے۔

''وہ میرے گھر پر ہی تھا''۔

''کیا مطلب؟''

''وہ... دراصل... میرا منگیتر ہے''۔

''اوہ''۔ اُس کی آواز جیسے دور سے سنائی دی۔ پھر—خود کو سنبھالا۔

''لیکن اگر تم گھر پر اکیلی ہو تو اُسے رات دیر تک تمہارے گھر نہیں ٹھہرنا چاہیے''۔

''وہ تو کئی دنوں سے میرے گھر میں ہی ٹھہرا رہا ہے''۔

''اُسے عجیب سا لگا۔ پھر غصہ آنے لگا۔

''تو پھر یہ تمہارا قصور ہے۔ تم نے اُسے گھر کیوں ٹھہرایا ہوا ہے؟ اُس کی آواز میں بھی تیزی آ گئی۔

ہیزل نے گہری سانس لی۔ اداس ہو گئی تھی بہت۔

''منگیتر کو میں کیسے روک سکتی ہوں...'' اُس کی آواز میں بھی کرب اُتر آیا تھا۔

''کیوں؟''

''میرے ڈیڈ مجھے جان سے مار ڈالیں گے اگر میں نے ایسا کیا تو''۔

''عجیب بات ہے''۔

''عجیب تو ہے''۔ وہ جیسے تلخی سے مسکرائی۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''ہوں''۔ اب وہ کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔

''یہ منگنی تمہاری مرضی سے ہوئی ہے؟''

اُسے یقین تھا اُسے منگیتر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جیسے مسلط کیا گیا تھا۔ اُس پر۔ کوئی شاپ میں بھی وہ اُسے گویا صرف برداشت کر رہی تھی۔ اِس وقت بھی اُس کا

تذکرہ بیزاری سے کر رہی تھی!

"نہیں"۔اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

تو اُس کا خیال درست تھا!

"پھر؟"

"ڈیڈ نے میری مرضی کے خلاف اِس سے میری منگنی کروائی ہے"۔

"کیسے ڈیڈ ہیں تمہارے"۔

"دیکھیں نا"۔وہ پھر مسکرادی۔دھیرے دھیرے وہ معمول پر آ رہی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔کہ کوئی تمہاری مرضی کے بغیر بھی کچھ کر سکتا ہے۔" اب وہ بھی خوشگواری سے بولا۔

"اچھا؟ کیا میں واقعی اتنی مضبوط چیز لگتی ہوں؟"

"میرے ساتھ تو کم از کم یہی کیا ہے تم نے"۔

وہ بے ساختہ ہنس دی۔اُس کا ڈِمپل بہت پیارا لگنے لگا۔

چند لمحے وہ اُسے یوں ہی دیکھتا رہا۔ پھر —ہولے سے اُس کا ڈِمپل اپنے پرکشش ہونٹوں سے چھولیا۔

"مائینڈ یو۔میری منگنی ہو چکی ہے"۔وہ سرخ سی ہوتے ہوئے بولی۔

"ہوتی رہے۔میں کب کچھ کہہ رہا ہوں"۔وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

بقول اُس کے وہ کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔پر اُس کی آنکھیں بول رہی تھیں۔زور وشور سے!

ہیزل سہار نہ سکی۔لمبی سیاہ پلکیں گرنے اٹھنے لگیں۔

وہ بے طرح محظوظ ہوا— پر جیسے کچھ خیال آیا۔

"مجھے اِس آدمی کا سیل نمبر دو"۔

"کیوں؟ کیا کریں گے آپ؟" وہ گھبرا سی گئی۔

"تمہیں اُس سے بچانا نہیں ہے؟"

اوہ— زار کے پرسکون ماحول میں آ کر وہ کچھ دیر کو جیسے بھول گئی تھی سب!

"لیکن دھیان سے۔وہ..." وہ اچانک چپ کر گئی۔

"وہ کیا؟"

"کچھ نہیں"۔وہ ٹالنے لگی۔

"دیکھو۔یوں ڈرتی رہیں تو کچھ نہیں کر سکو گی..."

"مجھے اپنی نہیں۔آپ کی فکر ہے"۔

وہ خوشگواری سے ہنس دیا۔

"چلو۔میری فکر تو کرنے لگیں۔اِسی بہانے سہی"۔

چند پل وہ یوں ہی اُس کی آنکھوں میں تکتی رہی۔چپ چاپ!

زار نے جواب پالیا۔اُس کی آنکھوں میں —Care ہی Care تھی اُس کے لئے!

"اچھا نمبر بتاؤ پلیز!"

"آپ کیا کہیں گے اُسے؟ کہیں میرے یہاں آنے کا نہ بتا دیں"۔

"میں تم جیسا بیوقوف نہیں ہوں۔اور پھر میں اُس کو کچھ نہیں کہنے جا رہا۔صرف اُس کا بندوبست کر رہا ہوں"۔

"کیسا بندوبست؟" وہ خوفزدہ سی لگنے لگی۔

"دیکھو"۔وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔"میں ہوں نا"۔

اور ––– ہیزل نے خود کو اُس کے سپرد کر دیا!

زار نے اُس سے اُس آدمی کا نام، سیل فون نمبر، کہاں رہتا تھا؟ گھر میں کون کون تھا؟ وغیرہ معلوم کیا۔ اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر کسی سے فون پر بات چیت کرتا رہا۔ پھر ––– واپس ہیزل کے پاس آ گیا۔ صوفے پر اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

وہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

”کامران صاحب کو ابھی ابھی اُس کے علاقے کے ہوسپٹل سے ڈاکٹر فون کرے گا۔ کہ اُس کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہوسپٹلائیزڈ ہے۔ سو وہ فوراً پہنچے...“

ہیزل کچھ حیرت زدہ سی، کچھ خوفزدہ سی اُسے دیکھے جا رہی تھی۔

”اور... اُسے وہاں جا کر پتہ چلے کہ سب غلط تھا تو پھر؟“

اُس نے خوبصورتی سے کندھے اُچکائے۔

”پھر ––– سر پیٹ لے گا اپنا اور کیا۔ تم سے تو ڈیڑھ سو میل دور چلا جائے گا نا۔ تم تو اپنے گھر جا سکو گی نا...“

”اوہ“۔ اُسے قدرے اطمینان ہوا۔ ”مگر وہ واپس آ گیا تو؟“

”اب بھی تم اُسے گھر میں گھسنے دو گی؟“۔ وہ حیرت سے بولا۔

”میں تو اُسے ایک لمحے کو بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ مگر ڈیڈ سے ڈر لگتا ہے...“

”یہ تمہارا چچا زاد یا پھوپھی زاد تو نہیں؟ میرا مطلب ہے۔ تمہارے ڈیڈ کے لئے یہی دو اہم رشتے ہیں۔ مگر ––– تم اُنہیں کہہ کیوں نہیں دیتیں۔ کہ وہ ایک character less آدمی ہے۔ بلکہ تم اپنے ڈیڈ سے کہہ کر یہ منگنی ہی کیوں نہیں ختم کرا دیتیں۔ جبکہ تمہاری مرضی بھی نہیں ہے...“

اُس نے گہری سانس لی۔ تلخی سے مسکرائی۔

”میں ایسا نہیں کر سکتی سوچ بھی نہیں سکتی ایسا کرنے کا۔“ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

وہ حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ بظاہر اتنی شان و شوکت والی۔ آن بان والی ––– اندر سے اتنی بے بس اور ٹوٹی ہوئی تھی؟

اُس نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ بس -- دھیرے سے اُسے اپنے پہلو سے لگا لیا۔ ہولے سے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

”تم ––– ذہن پر کوئی بوجھ مت ڈالو۔ میں کروں گا تمہارے لئے سب کچھ۔ انسان کرنا چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اور میں تو کروں گا بھی اِس لئے کہ –––“ اُس کا لہجہ اچانک شریر ہو گیا۔ آنکھوں میں شوخی اُتر آئی۔ ”مجھے لگتا ہے۔ کہ مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے...“

سرخ سا چہرہ لئے وہ اُسے دیکھنے لگی۔

”سوچ لیں“۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”مجھ تک پہنچنا اتنا آسان نہیں۔ آگ ہی آگ ہے میرے چاروں طرف“۔

”پیار تو بس ہو جاتا ہے۔ سوچنے کہاں دیتا ہے کمبخت“۔

وہ بے اختیار ہنس دی۔

”تو یہ بات ہے“۔ وہ بھی جیسے چند پل کو اپنے اِردگرد کی آگ کو بھول گئی۔ اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

”بالکل یہی بات ہے“۔ ایک بار پھر اُس نے اُسے پیار کیا۔

”اور... مجھے آپ سے پیار نہ ہوتا؟“

"وہ تو کبھی کا ہو چکا۔ تم منہ سے نہ کہو تو نہ سہی"۔

"اوہ... اتنا مان ہے اپنے اوپر"۔

"اِس سے بھی زیادہ"۔

"ہائے داوے۔ آپ کو یہ... پیار ہوا کب؟" اُس نے اُسے چھیڑا۔

"اب"۔ اُس نے اُسے گال پر پیار کیا۔

"سر! یہ تو کافی دنوں کا لگتا ہے"۔ وہ کافی دنوں سے اُس کی دلچسپی محسوس کر رہی تھی۔ اُسے یہاں وہاں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ یہ بھی جان چکی تھی۔

"ہاں۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "تمہیں کھوجتے کھوجتے میں خود کو کھو بیٹھا ہوں"۔

"کیا مطلب؟" وہ شوخی سے بولی۔

"یہی کہ... زار اب میرا نہیں رہا..."

"میرا ہو گیا۔" اس نے اُسکی بات پوری کر دی۔

"ہاں"۔ وہ بے اختیاراً سے پیار کرنے لگا۔

وہ بھی اُس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں گھر کر تھوڑی دیر کو دنیا بھلا بیٹھی۔

پھر— جیسے ہوش آ گیا۔ سیدھی ہو بیٹھی۔

"میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ مگر کامران اب بھی وہیں ہوا تو؟"

"تم گھر فون کرو۔ کوئی ایسا اعتباری بندہ ہے وہاں جس سے تم بات کر سکو؟"

"ہاں۔ اعتباری بندہ تو ہے۔ اشرف بابا۔ مگر اُن کو تو کامران نے باقی نوکروں کے ساتھ کہیں باہر بھجوا دیا تھا۔"

"اوہ— سیل ہے اُن کے پاس؟"

"ہاں"۔

"اُن سے پوچھو وہ کہاں ہیں؟ اور گھر جا کر پتہ کریں کہ کامران ہے یا چلا گیا؟ پھر تمہیں بتائیں"

"ہاں یہ ٹھیک ہے"۔

ہیزل نے اشرف بابا کو فون کیا۔ پتہ چلا۔ گھر پر ہی تھے۔ سخت پریشان تھے۔ بقول اُن کے کامران نے اُنہیں بھیج تو دیا تھا کسی کام کے بہانے گھر سے باہر۔ مگر فوراً ہی اُنہیں شک گزرا۔ واپس گھر چلے آئے۔ باقی نوکروں کو بھی واپس بلا لیا۔ ہیزل کی عدم موجودگی سے سخت پریشان تھے... انہوں نے ہی بتایا کہ کامران واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا...

"اچھا اب آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لئے کوفی بنا کر لاتا ہوں"۔

"جی اچھا"۔ وہ بہت مؤدب مگر شریر لہجے میں بولی۔

اور جواب میں زار نے اُسے پھر پیار کر لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں کے لئے کوفی بنا کر لے آیا۔ اُس کے لئے دودھ والی اور اپنے لئے بلیک۔

پاس پاس بیٹھے دونوں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ اور کوفی بھی پیتے جا رہے تھے۔ جہاں ہیزل کو بے شمار fears پریشان کر رہے تھے۔ وہاں زار کے من میں بھی بے پناہ سوال تھے۔ مگر—

دونوں ہی کچھ کہنے سے گریزاں تھے۔ ہیزل اِس لئے کہ اُس کی fears اتنی تھیں۔ کہ ایک sitting میں بیان کرنا ممکن ہی نہ تھا اور— زار اِس لئے— کہ وہ اتنی اَپ سیٹ ہیزل سے کچھ پوچھ کر اُسے مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک بار پھر ہیزل نے اشرف بابا کو فون کیا۔ اپنی تسلی کی۔ کامران جا چکا تھا۔ وہ

بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ زار اُس کے ساتھ ساتھ نیچے گیا۔ اُسے بھی اُس کی گاڑی میں بٹھایا۔ خود بھی اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ اور — ہیزل آگے اور وہ اُس کے پیچھے ہو لیا۔

آج — وہ ہیزل کے ساتھ اُس کے گھر کے اندر آ گیا۔ کار پورٹ میں۔

کیونکہ — وہ اُسے اندر لے آئی تھی۔ بہت سے پہرہ داروں کے سامنے۔ اشرف بابا کے سامنے۔

وہ — اپنی گاڑی کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ ہیزل گاڑی سے اُترتے ہوئے اُس کے پاس چلی آئی۔

"تھینکس کہوں؟" وہ مسکرائی۔

"ماروں گا"۔

اور — ہیزل کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"I love you." زار نے مزید کہا اور —

گاڑی واپس موڑ لی۔

باقی کی رات زار وقفے وقفے سے اُسے فون کرتا رہا۔ کہ کہیں کامران واپس تو نہیں لوٹ آیا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ واقعی جا چکا تھا۔

صبح چھ بجے جا کر کہیں وہ آرام سے سو گیا۔ پھر — سوتا ہی رہا۔ آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اُس نے فون کر کے ناشتہ کمرے میں منگوایا اور خود — گرم پانی کا شاور لینے واش روم میں چلا گیا۔

اپنی بالکنی میں بیٹھا، حسبِ معمول اِردگرد پھیلی ہر شے میں فطرت کی سرگوشیاں محسوس کرتا وہ ناشتہ کر رہا تھا۔

آج بادل ہی بادل تھے چہار سُو۔ نچلی ڈھلان اور ڈھلان پر بنے سوئیٹس نظروں

سے اوجھل ہو رہے تھے۔ بنگلہ سے سفید بادل اُسے نظرانداز کرتے اُس پرے سے ہوتے بالکنی کے کھلے دروازے میں سے اُس کے بیڈروم میں گھس رہے تھے اور — ایک مدھر سی مسکراہٹ اُس کے لبوں کو چھوگئی۔ بادل تو اُس کی سانسوں میں بھی گڈمڈ ہو رہے تھے۔

اِس علاقے کے بے پناہ حسن کا ایک حصہ ہیزل بھی تھی۔ یہیں پیدا ہوئی تھی، یہیں پلی بڑھی تھی۔ یہاں کے حسن کے ہر تیور کی گواہ تھی۔ تبھی شاید — گہری چھاپ تھی اُس پر یہاں کی ہر ادا کی!

پُرجلال دریا کی سی میجسٹی تھی اُس کی شخصیت میں ہفت رنگے موسم کی سی شوخی تھی طبیعت میں، رِم جھم برستی بوندوں کا ترنم تھا اُس کی ہنسی میں!

مگر — اِن سب پر اداسی غالب آ جاتی تھی۔ وہ مرجھا مرجھا جاتی تھی!

وہ — پوچھ کر رہے گا اُس سے۔ جان کر رہے گا سب کچھ!

معاً — اُس کا سیل بج اٹھا۔ ہیزل تھی۔

''Czar here.'' اُس نے کہا۔

''میں نے پہلے بھی کال کی تھی۔ آپ شاید سو رہے تھے''۔

''ہاں۔ چھ بجنے کے بعد سو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جاگا ہوں''۔

''کیا کر رہے ہیں؟'' اُس کا لب ولہجہ دوستی اور اپنائیت لئے تھا۔ وہ پہلے کی سی ناآشنائی اور اجنبیت نہیں تھی۔ جیسے اب وہ کوئی غیر نہیں تھا!

''ناشتہ کر رہا ہوں''۔

''اوہ — میری طرف کب آ رہے ہیں؟''

''ناشتہ کرتا ہوں۔ پھر چینج کر کے آتا ہوں۔ مگر — کہاں ملو گی؟''

''اپنے گھر پر''۔

''گھر پر؟'' اُسے جیسے یقین نہیں آیا۔ ''میں گھر پہ کیسے آ سکتا ہوں؟ کوئی اعتراض نہیں کرے گا؟''

''میرے اوپر کوئی بوس نہیں ہے جو اعتراض کرے''۔

''ہاں — عتاب تو سارا مجھ غریب پر پڑتا ہے''۔

وہ بے اختیار ہنس دی۔

''بوس تو آپ ہیں میرے۔ میں بچاری کیا عتاب کروں گی''۔

''چلو — آج دیکھتے ہیں۔ کون زیرِ عتاب ہے''۔

''چلیں۔ آئیں۔ لنچ آپ میرے ساتھ کریں گے''۔

''ٹھیک ہے''۔

''بائے''۔

''بائے''۔ زار نے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

وہ وہاں پہنچا۔ تو اشرف بابا نے اُسے ریسیو کیا۔ اور ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جلدی ہی ہیزل دروازے میں نمودار ہوئی۔ وہ احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر چونکا —

ہیزل نے پستئی رنگ کی پلین شلوار قمیض اور چوڑا سا خوبصورت پرنٹڈ دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ آج اُس نے covered کپڑے پہنے تھے۔ یقیناً اُس کی خواہش پر۔

وہ اُسے اور بھی پیاری لگنے لگی۔

''کیسے ہیں میرے کپڑے؟'' پاس آتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

''بہت اچھے ہیں''۔

''اب تو مجھے کیڑا ویڑا نہیں کاٹے گا نا؟'' اُس نے اُسے پک نک پر کہی اُس کی بات یاد دلائی۔

وہ بے اختیار ہنس دیا۔

''نہیں۔ اب نہیں کاٹے گا''۔

''بیٹھیں پلیز!'' اُس نے زار سے کہا۔ اور —

خود اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

زار بھی بیٹھ گیا۔

دونوں تازہ انگور کا جوس پی ہی رہے تھے۔ کہ بیرے نے آ کر کھانا لگنے کی اطلاع دی۔

زار ہیزل کی ہمراہی میں وسیع اور خوبصورت ڈائننگ روم میں آ گیا۔

بڑی سی ڈائننگ ٹیبل یہاں سے وہاں تک انواع واقسام کے کھانوں سے سجی تھی۔ پاکستانی اور چائنیز کھانے تھے۔ مختلف قسم کے سلاد اور پھل تھے!

یونیفارمڈ بیرے نے سامنے والی کرسی ہیزل کے لئے پیچھے کھسکائی۔ وہ بیٹھ گئی تو اُس کے دائیں والی کرسی زار کے لئے پیچھے کر دی۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔

دونوں دلچسپ باتوں کے دوران لذیذ کھانوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

آج جیسے زیادہ بوجھ نہیں تھا دونوں کے ذہنوں پر۔ اور اگر کچھ تھا بھی تو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔

کھانے کے بعد زار نے واپس جانا چاہا۔ کہ ہیزل اپنے دوپہر کا ریسٹ لے سکے۔ مگر ہیزل نے ہی اُسے جانے نہیں دیا۔ کہ بقول اُس کے ساڑھے تین تو بج ہی

چکے تھے۔ اور پھر جانے کیا تھا؟ جب تک وہ اُس کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہ خود کو بہت خوش اور بے حد سیکیور محسوس کر رہی تھی۔

وہ اُسے اوپر پیچھے والے ٹیرس پر لے آئی۔

سرخ کھپریل کی ڈھلانی چھت پر سے سیاہی مائل سرخ پھولوں کی بیلیں دَر دَر آ رہی تھیں۔ اُودی اُودی بوجھل گھٹائیں جھک جھک آ رہی تھیں اور — سامنے تاحدِ نگاہ پکی ہوئی چیریز سے لدے درخت ہوا کے سنگ جھوم جھوم رہے تھے۔

دونوں کین کی نرم و گداز کشنڈ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

تبھی — اشرف بابا ٹرے میں سبز چائے لئے آ گئے۔

اُس نے نوٹ کیا۔ اشرف بابا کو ہیزل خاص طور پر عزت دے رہی تھی۔ لگتا تھا اُس کا خاص اور خیر خواہ ملازم تھا۔

اشرف بابا خالی ٹرے لئے واپس چلے گئے۔ ہیزل نے اُس کے لئے چائے بنائی۔ اُس کے آگے رکھی۔

''تھینک یو میم''۔ اُس کا کپ اٹھایا۔ ''ویسے آج تم۔ ذرا زیادہ میرا خیال نہیں رکھ رہیں''۔

وہ بے ساختہ ہنس دی۔

''آج آپ میرے مہمان ہیں نا''۔

''اِس کا مطلب ہے مہمان نہ ہوتا۔ تو یہ مہربانی نہ ہوتی''۔

''پھر بھی ہوتی''۔

''پھر کیوں ہوتی؟''

''پھر اِس لئے ہوئی کہ۔ اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ چائے کا کپ اپنے

قریب کیا۔

''کہ؟''

''کہ۔۔۔ آپ مجھ سے بڑے بھی تو ہیں''۔

''بس؟'' جانے کہنا چاہتا تھا وہ؟

''نہیں''۔ وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

''تو؟''

''آپ کیا سننا چاہتے ہیں؟''

''جو تمہارے دل میں ہے''۔

وہ ہنسنے لگی۔ دلآویزی سے۔

''آپ کے لئے'' اس کے لب و لہجے میں شوخی تھی۔

''ہاں''۔

''مایوسی ہو گی جانِ''۔

''مایوسی نام کی چیز میری کتاب میں نہیں ہے''۔

''Oh wow.'' وہ متاثر سی نظر آنے لگی۔

''بتاؤ نا''۔

''کوئی ایسی بات نہیں جو آپ کو ناگوار گزرے تو؟''

''تمہارا کیا خیال ہے میں نے آج تک اپنی زندگی میں کوئی ناگوار بات سنی ہی نہیں؟''

''کسی لڑکی کی زبانی تو نہیں سنی ہو گی نا''۔

''آج سن لوں گا''۔ ساتھ ہی ایک غیر محسوس سا سایہ اُس کے پرکشش چہرے

پر لہرایا۔ جانے کیا کہنے والی تھی وہ؟

''خفا تو نہیں ہوں گے؟''

''نو''۔

''Are you sure?''

''Yea, I'm sure.'' پھر بھی وہ اندر سے ٹوٹتے سا لگا تھا۔

ہیزل نے ایک پل کو اُس کی آنکھوں میں دیکھا پھر — آہستہ سے سر اُس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

''I love you Czar. یہ سب کیسے ہوا؟ مجھے کچھ پتہ نہیں چلا۔ کیوں ہوا؟ یہ بھی نہیں جانتی۔ آپ سے ملتی ہوں تو جیسے زندگی ملتی ہے۔ نہیں ملتی، تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ اپنی منگنی کا خیال آتا ہے، تو جیسے پھانسی کا پھندا ہو۔ خیال جھٹکتی ہوں، تو لاشعور میں بس کر کچو کے لگاتا رہتا ہے۔ کسی خوشی کی، کسی اچھی بات کی سمجھ نہیں آتی۔ ادھوری ادھوری رہتی ہوں۔ کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح...''

زار اُس کے خوبصورت مہکتے بالوں میں چہرہ دیئے دھیرے دھیرے اُسے پیار کرتا رہا۔ اُس کے جسم کی شبنم میں بھیگے حسین پھولوں کی سی خوشبو من میں اتارتا رہا۔

''I love you too. تم کون ہو؟ کیا ہو؟ سمجھنا چاہوں بھی تو دل موقعہ نہیں دیتا''۔ اُس نے جھکا سر اٹھایا۔ گہری سانس لی۔ ''تم ہی تم ہو دل میں تو — ذہن بیچارا بے بس ہو کر لوٹ آتا ہے...''

ہیزل نے بھی سر اٹھا لیا۔ چند پل اُس کی دلنشیں آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ چپ چاپ۔ پھر— یکبارگی اُس سے لپٹ گئی۔

''زار۔ مجھے چھپا لیں۔'' وہ اُس کے سینے میں سمونے لگی۔ ''یہاں سے دور

لیجائیں۔ بہت دور۔ جہاں کسی کو میری خبر نہ ملے۔ جہاں مجھے کسی کی خبر نہ ملے...“

زار نے اُسے اپنے سینے سے جکڑ لیا۔ بہت سارا پیار کیا۔ ڈھیروں تسلیاں دیں۔

وہ واقعی مطمئن ہوگئی۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی۔

”چائے تو ٹھنڈی ہوگئی ہے“۔ وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرا دی۔

دھوپ چھاؤں کا یہ امتزاج بہت حسین تھا۔ وہ بے حد محظوظ ہوا۔

”کوئی بات نہیں۔ ٹھنڈی پی لیتے ہیں“۔

”نہیں۔ اور آجائے گی۔“

اُس نے اپنے سیل پر دوبارہ گرم چائے منگوالی۔

”ہیزل“۔

”جی“۔

”ایک بات پوچھوں؟“ وہ کچھ متذبذب سا بھی تھا۔

وہ اتنے اچھے موڈ میں تھی۔ جانے کیا ردِعمل ہوتا اُس کا اُس کی بات سن کر؟

مگر— کہنا بھی تو ضروری تھا!

”پوچھیں“۔

”تم— یہ غیر قانونی کام کیوں کرتی ہو؟“

اُسے جیسے سپرنگ لگ گئے۔ یکبارگی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کون ہیں آپ؟“ اب وہ یکسر ایک بدلا ہوا انسان تھی۔

اُس نے اُسے ہاتھ سے تھام لیا۔

”تمہارا خیر خواہ ہوں ...“

”میں پوچھتی ہوں کون ہیں آپ؟“ اُس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”کہا نا۔ تمہارا Well wisher ہوں“۔

”آپ چلے جائیں یہاں سے، ابھی، اِسی وقت“۔

وہ وہیں بیٹھا رہا۔ کہ آج اُس نے سب کچھ جان کر رہنا تھا۔ وہ اِسی سلسلے میں تو یہاں آیا تھا۔ وہ ایک سمگلر تھی۔ اُس کے باغات کے پھلوں میں چھپا کر بڑے پیمانے پر افیون اور چرس کی سمگلنگ ہو رہی تھی۔ جب اُسے یہ اسائنمنٹ ملی تھی۔ تب وہ اُسے ایک ادھیڑ عمر تجربہ کار اور ایک کرخت عورت معلوم ہوئی تھی۔ مگر— یہاں آ کر دیکھا۔ تو سخت حیرت ہوئی۔ اُس کی عمر، اُس کا بھولپن اور اچھائی دیکھ کر اُسے اُس پر ترس آیا۔ ہمدردی ہونے لگی۔ تجسس بھی کہ—

آخر اتنی مال و دولت ہونے کے باوجود اُسے سمگلنگ جیسی مکروہ چیز کی کیوں ضرورت پڑی؟ کیوں ایسے risky کام میں ہاتھ ڈالا؟

”نو مَیم۔ میں یہاں سے جانے والا نہیں“۔ وہ ڈٹ کر بیٹھ گیا۔ ”تمہیں آج بتانا ہوگا سب۔ ورنہ دوسری صورت میں تمہیں ہتھکڑی بھی لگ سکتی ہے...“

”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟“ وہ اب بھی کھڑی تھی۔ لہجہ ابھی بھی سخت تھا۔

”نہیں۔ میں ریکویسٹ کر رہا ہوں۔ تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ مدد کرنا چاہتا ہوں تمہاری۔ جس راہ پر تم جا رہی ہو۔ وہ بہت خطرناک راستہ ہے۔ صرف جیل نہیں۔ تمہاری عزت تک خطرے میں ہے اِس کام میں...“

”تو آپ یہ سب جاننے کے لئے میرے قریب آئے؟“ وہ جیسے ٹوٹ سی گئی تھی۔ آہستہ سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”نہیں۔ میں پہلے چند دنوں میں ہی اپنی اسائنمنٹ مکمل کر چکا تھا۔ تمہارے

باغات، گودام، فروٹ پروسسنگ، کریٹس کے اندر افیون اور چرس کی تھیلیاں، سب چیک کر چکا تھا۔ جس دن میں نے تمہیں پک نک پر جانے کی آفر کی تھی۔ اُس سے کچھ دیر پہلے جو شخص تمہیں چراگاہ میں ملنے آیا تھا۔ اُس کا مقصد بھی میں نے معلوم کرلیا تھا۔ تمہارے ساتھ ٹرین میں مَیں نے اتفاقاً سفر نہیں کیا تھا۔ بلکہ یہاں سے تمہارا اور اُس شخص کا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا۔ تمہارے علاقے میں مَیں نے فشنگ شوقیہ نہیں کی تھی۔ وہاں واقع گھر اندوں میں تم کس مقصد سے جاتی تھیں یہ جاننا چاہتا تھا۔ میں ایک پل بھی آرام سے نہیں بیٹھا تھا۔ مسلسل تمہاری نگرانی کر رہا تھا۔ ساتھ میں...'' اُس نے قدرے توقف کیا۔ ''مسلسل ہی تمہاری حفاظت کرتا رہا کہ...''

آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں لئے چونکتے ہوئے ہیزل نے اُسکی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''کہ — ہمدردی کرتے کرتے مجھے تم سے پیار ہو چلا تھا۔ You had become so precious for me. اُن غلیظ لوگوں کی کمپنی میں مَیں تمہیں ایک سیکنڈ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا...''

اور — ہیزل نے سر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔

پھر — اتنا روئی اتنا روئی کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکال لی۔

''میں کل واپس جا رہا ہوں۔ میں نے تمام ثبوت اکٹھے کر لئے ہیں۔ میں اپنے پیشے سے بے ایمانی نہیں کر سکتا۔ لیکن تم سے محبت ہے۔ اس لئے چاہوں گا کہ تم خود ہی خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ تاکہ مجھے تمہاری مدد کرنے میں آسانی ہو...''

''پولیس آفیسر ہیں آپ؟''

''نو''

''پھر؟''

''جرنلسٹ ہوں۔ اور سچ کو بے نقاب کرنا میرا پروفیشن بھی ہے ایمان بھی۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو...''

''اوہ''۔

وہ چند پل خاموش رہی۔ سامنے دیکھتی رہی۔ پھر — رخ اُس کی طرف کر لیا۔

''یہ کاروبار میں نہیں کرتی۔ کروایا جاتا ہے مجھ سے''۔ وہ آہستہ سے بولی۔

''کیا مطلب؟'' وہ کچھ سمجھا نہیں۔

''یہ سب مجھ سے میرے ڈیڈ کرواتے ہیں...''

''کیا؟'' اُس پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

تبھی — اشرف بابا چائے کی ٹرے لئے آ گئے۔

دونوں ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔

اب کے زار نے اُس کے لئے چائے بنائی۔ کپ اُس کے آگے رکھا۔ خود اپنے لئے چائے بنانے لگا۔

وہ خاموش تھی۔ کچھ اکٹھا کر رہی تھی جیسے۔ یادیں، باتیں!

''ذوالفقار شاہ میرا اپنا باپ نہیں ہے''۔ کپ اٹھاتے ہوئے اُس نے ابتدا کی۔ ''جب میں گیارہ سال کی تھی اور میرا بھائی نادر چند ماہ کا تھا۔ تو میرے پاپا شاہ نواز خان کی ڈیتھ ہو گئی۔ پتہ نہیں کہاں سے ذوالفقار شاہ اچانک اس علاقے میں گرمی کا سیزن گزارنے آ گیا۔ جلدی ہی میری امی کو اکیلی، جوان، چھوٹے بچوں اور بھاری بھرکم کاروبار کے نہ سنبھال سکنے کا احساس دِلا دِلا کر اپنے جال میں پھنسا لیا۔ اُن سے شادی کر لی۔ فوراً ہی اُس کی عیاشیاں اور اوباشیاں سامنے آنے لگیں۔ اور یہ بھی کہ میری

امی کے ساتھ شادی اُن کی بے تحاشا املاک اور ایک ایسے علاقے میں اُن کے قیام کی وجہ تھی جس کو اڈا بنا کر وہ سمگلنگ کرسکتا تھا۔ یہ ہی نہیں ....وہ تو .... عورتوں کی بھی سمگلنگ کرتا ہے...''

''گڈ گوڈ!'' وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

''میری امی تو چار مہینے ہی زندہ رہ کر چل بسیں۔ میں سمجھی اب میں اور میرا بھائی اپنے اسٹیٹ میں قدرے چین سے رہ سکیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ میرے سال بھر کے بھائی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ ملک سے باہر رہتا ہے، دوبئی .... کم ہی پاکستان آتا ہے۔ اور میں اگر اُس کے لئے کام نہ کروں۔ تو اُس نے دھمکی دی ہے۔ کہ وہ میرے بھائی کو جان سے مار ڈالے گا۔ اُس کے لئے کسی کو مار دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ اور میں... اپنے بھائی کی زندگی کے لئے کچھ بھی کرسکتی ہوں...''

''اوہ—'' گنگ سا وہ بمشکل بولا۔

ہیزل کے دکھ لامتناہی تھے، مجبوریاں اَن گنت!

آج اُسے ہیزل کے پُرکشش چہرے پر چھائی ہردم اُداسی کا جواب مل گیا!

اُس کی Mysterious طرزِ زندگی جو اُسے اُلجھن میں ڈالے رہتی تھی۔ اُس کا بھی جواز مل گیا!

''اور—یہ کامران کون ہے؟''

''ڈیڈ کی پہلی بیوی کا بیٹا ہے۔''

''اوہ—تو تمہاری باقی کی املاک وہ اُس کے ذریعے ہتھیانا چاہتا ہے''۔

وہ تلخی سے مسکرا دی۔ بولی کچھ نہیں۔

زارنے گہری سانس لی۔ چائے کا آخری گھونٹ لیا۔ اور خالی کپ میز پر رکھ دیا۔

گھڑی پر نگاہ کی۔ پانچ بجنے کو تھے۔ پورے آکاش کو گھیرنے میں لئے سرئی گھٹائیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ دریا کے پانیوں کو چھو چھو کر آتے یخ بستہ ہوا کے جھونکے بھیگے بھیگے تھے اور—دور اُس پار وقت سے پہلے ہی شام نے ڈیرے ڈال دیئے تھے۔

''ہیزل''۔ وہ دھیرے سے بولا۔

ہیزل نظریں اٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔

''مجھے معاف کر دو گی؟''

اُس نے تھکی سی سانس لی۔ آنکھیں پھر سے نم ہوگئیں۔ بولی کچھ نہیں۔

وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اُس کے آگے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

''پلیز! معاف کر دو مجھے۔ میں پتہ نہیں کیا کیا کہہ گیا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔ خاص طور سے جب مجھے تمہارے حالات بھی معلوم نہیں تھے۔ میں...''

اُس نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ بس چپ چاپ انگلیوں کی پوروں سے گالوں پر ڈھلکتے آنسو پونچھ لئے۔

''یہ دیکھو۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں''۔ اُس نے واقعی ہاتھ جوڑ لئے۔

ہیزل نے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔

''اِس میں آپ کا کیا قصور ہے۔ آپ تو اپنی ڈیوٹی نبھا رہے ہیں''۔ اُس کے مزید آنسو نکل آئے۔

کتنا روتی رہتی تھی وہ؟ بعض انسانوں کی قسمت میں کتنے دکھ ہوتے ہیں؟ اور وہ بھی اتنی سی عمر میں۔

زارنے اُس کے ہاتھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

”میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ تم آئندہ کبھی نہ رو دو۔ تمہاری عمر رونے کی نہیں ہے۔ ہنستے رہنے کی ہے...“

اُس کے ہاتھوں پر ماتھا ٹیک کر وہ اور بھی رو دی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”ہیزل پلیز! اور نہیں رونا“۔ وہ اُس کے بالوں پر پیار کرنے لگا۔ ”اپنے سارے دکھ سارے غم مجھے دیدو۔ میں ہوں نا تمہارا درد بانٹنے کیلئے“۔

اُس نے اُس کا جھکا سر اٹھایا۔ بال سہلائے۔ آنسو خشک کیے۔ ”اب بتاؤ۔ مجھے معاف کر دیا نا؟“ ماحول کو خوشگوار بنانے کی خاطر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں“۔ وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرا دی۔

اُس نے اُس کی بھیگی بھیگی آنکھوں پر باری باری پیار کیا۔ پھر اُس کے قریب ہی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ہیزل۔ تمہیں اب اور یہاں نہیں رہنا چاہئے۔ بہتر ہوگا تم یہاں سے کہیں اور شِفٹ ہو جاؤ“۔

”اگر میں یہاں سے کہیں اور شِفٹ ہو گئی۔ تو اُسی دن میرے بھائی کو قتل کر دیا جائے گا۔

”ایسا نہیں ہوگا انشاءاللہ۔ پہلے اُس کو وہاں سے نکالنے کا بندوبست کیا جائے گا۔ اُس کے بعد میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ کیونکہ یہاں تمہاری زندگی کو خطرہ ہے...“

”اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ ایک جرنلسٹ کو تو ذوالفقار شاہ پہلے ہی کڈنیپ کروا چکا ہے۔ پتہ نہیں زندہ بھی ہے یا نہیں“؟ وہ اب قدرے سنبھل گئی تھی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔

”کیا؟“

”ہاں“۔ اُس نے خوشگواری سے کہا۔

”تمہیں اُس جرنلسٹ کا نام پتہ ہے؟“ اُسے تجسس ہوئی کہ کئی جرنلسٹس اغوا اور مروائے جا چکے تھے اب تک۔

”نہیں۔ مجھے اُس کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ تو نوکر آپس میں بات کر رہے تھے۔ تو اشرف بابا نے سن لیا تھا۔ اُنہوں نے ہی مجھے بتایا سب“۔

”یہ باتیں تو مجھے بالکل معلوم نہیں تھیں...“ وہ اب بھی متحیر سا تھا۔ اُسے تو صرف یہ بتایا گیا تھا۔ کہ ایک ہیزل نامی خاتون یہاں سے افیون اور چرس ملک سے باہر سمگل کرتی ہے۔ اُس کے ثبوت فراہم کرنے ہیں۔

”اُس کی باتیں باہر نکلتی بھی نہیں ہیں۔ بلکہ نکالی ہی نہیں جا سکتیں۔ ہر ایک کو اپنی جان پیاری ہے۔ اور اگر کہیں ایسا ہو بھی گیا تو اُسے بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اُس کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ بقول اُس کے، اُسکے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ بڑے بڑے حکومتی عہدیدار اُس کی مٹھی میں ہیں۔ وہ کہتا ہے پیسے میں بہت طاقت ہے...“

”مگر — وہ کسی جرنلسٹ کو نہیں خرید سکتا۔ صحافی ایک ایسی نڈر کمیونٹی ہے۔ جو اغواء بھی ہوتے ہیں، قتل بھی ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتے رہتے ہیں۔ تمام خطرات کے باوجود دنیا بھر میں جاتے ہیں۔ مشکل ترین حالات سے گزرتے ہیں۔ اِس کے باوجود ملک اور قوم کو حقائق سے آگاہ رکھتے ہیں۔ لوگوں کی پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاتے ہیں...“

ہیزل غور سے سن رہی تھی۔ وہ ایک highly professional جرنلسٹ تھی۔ اُسے اچھا لگا!

''وہی تو کہہ رہی ہوں حضور کہ ...ذوالفقار شاہ کو پتہ چلا کہ ایک جرنلسٹ مجھ سے ملنے میرے گھر تک آیا ہے تو...''

وہ ہنس دیا — دلآویزی سے۔

''بچارا جرنلسٹ کیا کرے۔ پیار جو ہوگیا ہے اُسے۔ گھر تک تو آئے گا۔ اور پھر — مجھے کسی ذوالفقار شاہ سے ڈر نہیں لگتا۔ دیکھتا ہوں کیا کرتا ہے میرا؟''

مگر ہیزل کو تسلی نہیں ہوئی۔ ایک گہری تھکی سانس لی۔

''زار وہ واقعی بہت خطرناک آدمی ہے۔ میں مذاق نہیں کر رہی۔''

''میں بھی — مذاق نہیں کر رہا۔ مجھے بھی پچھلے دنوں دھمکیاں ملتی رہی ہیں جان سے مار ڈالنے کی۔ مگر — فرض تو نبھانا ہے۔ اپنے پروفیشن کی لاج تو رکھنی ہے۔ جان جائے تو جائے...''

''اب اس جان میں میری بھی جان ہے۔ یہ مت بھولیں''۔

وہ اُڈورنگ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر — ہولے سے مسکرا دیا۔

''اور اب — تمہاری جان میں میری بھی جان ہے۔ خیال رکھنا۔''

وہ اپنائیت سے اُسے دیکھتی رہی۔ زرّیں آنکھوں میں محبت کا ایک جہان آباد تھا۔

چند پل دونوں ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ خاموشی سے۔

''میرے بارے میں تو آپ سب جانتے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے ہی''۔

ہیزل دھیرے سے گویا ہوئی۔ ''مگر اپنے بارے میں چھپائے رکھا سب...''

وہ بے اختیار ہنس دیا۔

''چلو اب بتا دیتا ہوں۔ میں ایک پرائیویٹ خبر رساں ایجنسی کے لئے کام کرتا

ہوں۔ چند ماہ پہلے ہی امیریکہ سے پاکستان آیا ہوں۔ وہاں بھی جرنلسٹ تھا۔ پھر یہاں بھی اپنے پروفیشن سے وابستہ ہوگیا۔ ہاں یہ بہت خوبصورت اتفاق ہے۔ کہ مجھے پہلی اسائنمنٹ تمہاری ہی ملی...''

''اوہ''۔ وہ دھیرے سے بولی۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں''۔

''آپ جو مجھے مختلف جگہوں پر ملتے رہے تھے۔ کیا وہ واقعی اتفاق تھا؟''

زار کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''نو میم۔ تم سے میری پہلی ملاقات ہی اپنے پروفیشن کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ تمہیں ہی کھوجتا ہوا میں تمہارے گھر سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ واپس آنے لگا۔ تمہارے گھر کے قریب آیا۔ تو قسمت یاور ہوئی اور تم مجھے تمہارے گھر سے نیچے اُترتیں سڑک کی طرف آتی دکھائی دیں...''

''اوہ — اور فرض کیا۔ میری گاڑی میں فیول ختم نہ ہوا ہوتا اور میں نہ رکتی تو؟''

پٹرول ختم ہونے کی وجہ سے ہی تو وہ رکی تھی وہاں۔ تبھی تو وہ آیا تھا اُس کے پاس!

''ایسا نہ ہوتا۔ تو کچھ اور ہو جاتا''۔

''مثلاً''

''تم جہاں بھی گاڑی کھڑی کرتیں۔ وہیل پنکچر ہو جاتا''۔

''اور وہ پنکچر آپ کرتے؟''

''ظاہر ہے۔ اور پھر تم مجبوراً آگے نہ جاسکتیں۔ کسی نہ کسی کے ہیلپ کی ضرورت پڑتی...''

''اور وہ ہیلپ آپ کرتے''۔

"یقیناً"۔

"آپ پوری چیز ہیں"۔

"تمہیں اب پتہ چلا"۔

"نہیں۔ جب بارش میں آپ میری گاڑی میں زبردستی گھستے ہوئے بازار سے میرے ساتھ 'Jade Hills Hotel' تک آئے تھے۔ تب پتہ چلا تھا۔"

وہ ایک بار پھر ہنس دیا۔ خوشگواری سے۔

"شروع میں تو مَیں نے ہر قدم پر تمہارا پیچھا کیا تھا۔ جس دن میں نے تمہارے پچھلے گیٹ کے پاس تم سے اِن باغوں میں گھومنے پھرنے کی خواہش ظاہر کی تھی"۔ اُس نے سامنے تاحدِ نظر پھیلیں چیریز کی طرف اشارہ کیا۔ "اُس سے ایک شام پہلے ہی میں بہت تفصیل سے اِن میں گھوم پھر چکا تھا۔ فروٹ پروسسنگ سیل کا چوکیدار جوں ہی تھوڑی دیر کو وہاں سے ہٹا تھا۔ اندر گھستے ہوئے میں نے فروٹ کی پیٹیاں چیک کی تھیں۔ مجھے افیون اور چرس کی تلاش تھی۔ جلدی ہی ایک پیٹی میں سے چھوٹی سی سفید تھیلی ملی۔ جس میں افیون تھی..." اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی کہ ——

ہیزل گھائل سی لگنے لگی تھی۔ کرب اتر آیا تھا اُس کی خوبصورت آنکھوں میں۔

"آپ میری مجبوریوں کا اندازہ نہیں کر سکتے..." ایک بار پھر اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"سوری ہیزل۔ میرا مطلب تمہیں دکھ دینے کا ہرگز نہیں تھا"۔ اُس نے اُس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ "پلیز! مجھے معاف کر دو۔" اُس نے اُس کا ماتھا اپنے پرکشش ہونٹوں سے چھوا۔

"کوئی بات نہیں۔ آپ جو کرنا چاہیں۔ کر لیں۔ میں نے پہلے ہی بہت دکھ سہے

ہیں۔ کچھ اور سہی..."

"ایسا مت کہو پلیز!" وہ کرب سے بولا۔ "اب دُکھ نہیں۔ سکھ آئیں گے تمہاری زندگی میں۔ زندگی کتنی خوبصورت ہے تم خود دیکھ لوگی..."

"چھوڑیں نا۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مَیں اور خوشیاں... دو متضاد چیزیں ہیں..."

"بس۔ اب ایک لفظ بھی اور مت کہنا۔" اُس نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "تمہارے سب دکھ اب میرے ہیں۔ میں نمٹوں گا اِن سے۔"

ہیزل نے سر اوپر اٹھایا۔ اُس کی طرف دیکھا۔ جیسے دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ واقعی اتنا ہی سچا تھا؟

اور —— اُس کی آنکھوں میں اُسے سچائی ہی سچائی نظر آئی۔ صداقت اور امانت نظر آئی۔ اُس نے سر واپس اُس کے سینے سے ٹکا لیا۔

"ہمارے پاس اب وقت بالکل کم ہے۔ تم آج ہی نادر سے بات کرو۔ کہ وہ کسی طرح اپنا پاسپورٹ اپنے ہاتھ میں لے لے۔ میں کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ اور جلد سے جلد اُس تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ جب واپس لوٹوں گا تو نادر میرے ساتھ ہوگا انشاءاللہ.."

"آپ اُسے سکول میں ملیں اور وہیں سے اُسے نکالنے کی کوشش کریں"۔

"ٹھیک ہے۔ اب چلتا ہوں۔ کل واپس کراچی اپنے گھر جاؤں گا۔ اور پھر فوراً وہاں سے نادر کے لئے روانہ ہوں گا..."

"کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟" وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ "کیا نادر سچ مچ میرے پاس آ جائے گا؟" خوشی کے ساتھ ساتھ وہ بے یقینی سے دوچار تھی۔

''بس تم خدا سے دعا کرو۔ سننے اور کرنے والا تو وہ ہی ہے''۔

''ٹھیک ہے''۔

''ویسے یہ اشرف بابا اچھا آدمی لگتا ہے''۔ اُسے ہیزل کی سکیورٹی کی بہرحال فکر تھی۔ ''تمہارا خیال تو رکھے گا نا؟''

''یہ میرے پاپا کے وقتوں کے ہیں۔ اُن کی ڈیتھ کے بعد بھی یہیں تھے۔ پھر امی کی ذوالفقار شاہ سے شادی کے پروگرام سے آگاہ ہوئے۔ تو کام چھوڑ کر چلے گئے۔ انہیں پاپا سے بہت عقیدت تھی۔ ذوالفقار شاہ کے اِس گھر میں آنے سے قبل ہی یہاں سے چلے گئے۔ باقی ملازم بھی کچھ نئے ہیں کچھ پرانے ہیں۔ مگر اشرف بابا کی بات اور ہے۔ یہ سب سے پرانے بھی ہیں اور بہت sincere بھی ہیں۔ جب انہیں امی کی ڈیتھ کا پتہ چلا تو واپس چلے آئے۔ کہ میں اور نادر اب اکیلے تھے۔ جہاں میں بہت خوش ہوئی۔ وہاں وہ ذوالفقار شاہ کو بالکل اچھے نہیں لگے۔ کہا تو کچھ نہیں۔ مگر جب بھی آتا ہے زیرِ عتاب ہی رہتے ہیں بابا۔ ایک دفعہ تو بہت گرجا تھا بابا پر۔ مار ڈالنے تک کی دھمکی دے دی تھی۔ تب میں بھی ڈر گئی تھی کہ وہ تو کچھ بھی کر سکتا تھا۔ پر۔۔بابا کہتے تھے۔ کہ 'تم بالکل فکر مت کرو۔ میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے'...''

''گڈ۔ چلو کوئی تو ہے اِس دنیا میں جو بغیر کسی لالچ کے بھی اپنی زندگی کا رِسک لیتا ہے۔'' وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

''بہت اچھے ہیں بابا''۔ اُس کے لب و لہجے میں اُن کے لئے بہت عقیدت تھی۔

''ویسے آج جو باتیں تم نے ذوالفقار شاہ کے بارے میں بتائی ہیں اُس سے میری اور بھی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ کیا سنسنی خیز انکشافات ہیں۔ تم دیکھتی رہو۔ کیسے

میں اِس کو اور اِس کی مٹھی میں بند حکومتی عہدیداروں کو بے نقاب کرتا ہوں...''

''مجھے سخت ڈر لگ رہا ہے۔ یہ بے حد رِسکی کام ہے۔ آپ کو کچھ ہو گیا تو...'' اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سر ایک بار پھر اُس کے کندھے سے ٹکا لیا۔

''تو؟'' اُس نے اُس کے چہرے پر گھر آئی بالوں کی لٹ انگلی سے پیچھے ہٹائی۔

''تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی''۔

''ایسا نہیں کہتے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بہت بڑا کارساز ہے''۔

کافی دیر تک وہ یوں ہی اُسے تسلیاں دیتا رہا۔ ہمت بندھاتا رہا۔

''میں تمہارے پاس اپنے گھر کا ایڈریس، فون نمبرز وغیرہ چھوڑے جا رہا ہوں۔ جوں ہی میں وہاں سے نادر کو پک کرتا ہوں۔ تم فوراً یہاں سے ہمارے گھر روانہ ہو جانا۔ اکیلی نہیں اشرف بابا کو بھی ساتھ لیتی جانا''۔

''ٹھیک ہے''۔

''ویسے ــ تم گھر سے باہر جاتی ہو۔ تو نوکروں یا گارڈز کو بتا کر جاتی ہو؟'' اُسے ویسے ہی خیال آیا۔

وہ مسکرا دی۔ دلآویزی سے۔

''یہ لوگ مجھے بتا کر جاتے ہیں۔ میں نہیں...''

اُس کی گھنی بھوئیں اوپر اٹھ گئیں۔ خوبصورتی سے مسکرایا۔

''میں پھر بھول گیا تھا۔ کہ تم اپنی بوس خود ہو ــ بائے داوے رات تم اتنی دیر سے گھر آئیں۔ ساتھ میں مَیں بھی تھا۔ کسی نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا؟''

اب کے وہ ہنس دی۔ وہی پریوں کے دیس کے پائیلوں کی سی ہنسی!

''میں نے کہا نا۔ میں کسی کو جوابدہ نہیں ہوں...''

''ذوالفقار شاہ کو بھی نہیں؟''

''اُسکا مجھ سے صرف اُس کی بزنس کی حد تک کام ہے اور یہ بھی کہ میں اُس کی بزنس کا کسی اور کو نہیں بتاؤں گی...''

''لیکن اب تو اُس نے اپنے بیٹے کے ساتھ بھی تمہارا رشتہ جوڑ دیا ہے۔ اب تو شاید تمہاری activities پر نظر رکھے گا...''

''اتنا ہی نا۔ کہ میں کسی اور کے ساتھ بھاگ نہ جاؤں؟''

زار کا جاندار قہقہہ ابھرا۔

''اور میں تمہیں بھگا کر لے گیا تو؟''

''آپ مجھے بھگا کر مت لے جائیں۔ ہاتھ پکڑ کر سب کے سامنے لے جائیں''۔

اُس نے بہت گہری بات کی تھی۔ اُسے اچھی لگی۔

ہولے سے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

''ایسا ہی ہوگا۔ بس تم دعا کرو۔

اُس نے دھیرے سے سر اثبات میں ہلایا۔

''اب چلتا ہوں، ہاں۔''

سرمئی گھٹاؤں میں بجلیاں تڑپنے لگی تھیں۔ شام میں تاریکیاں اتر آئی تھیں۔

اور --- سردی سوا ہو گئی تھی۔

ہوٹیل آتے ہوئے وہ تمام راستہ ہیزل کے بارے میں سوچتا رہا۔

دور سے اتنی confident، بااختیار اور بارعب سی لڑکی --- نزدیک سے کتنی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ چور چور، ریزہ ریزہ!

اپنی تو جیسے اُس کی زندگی تھی ہی نہیں۔ ذوالفقار شاہ کے لئے کام کرتی تھی۔

کامران کی پابند تھی اور --- ذرا سے قدم ڈگمگائے تو بھائی اب گیا کہ اب!

کتنا ظالم تھا ذوالفقار شاہ۔ پہلے اُس کی ماں کو پھنسایا۔ پھر اُس کے اسٹیٹ کو اڈا بنایا۔ اب اُس کے دونوں بچوں پر بھی قابض ہو گیا تھا۔ کس مکاری سے سب کچھ اپنی مٹھی میں کر لیا تھا اُس نے!

تھکا تھکایا سا وہ 'Jade Hills Hotel' پہنچا۔ پارکنگ میں گاڑی لگائی۔ اور حسب معمول پگڈنڈی پر شارٹ کٹ لیتا اپنے سویٹ میں آ گیا۔

کپڑے تبدیل کرتے ہوئے وہ لِونگ روم میں آ کر صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے آج کا اخبار دیکھنے لگا۔

ڈنر کا ٹائم ہوا۔ تو کھانا اپنے سویٹ میں منگوا لیا۔ پتہ نہیں کیوں؟ جب سے ہیزل کے حالات سے آگاہ ہوا تھا۔ ذہنی اور جسمانی دونوں طور پر exhaust ہو گیا تھا جیسے۔ ڈائننگ ہال میں جانے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

کھانے کو بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ بس ویجیٹیبل سوپ لیا۔ اور ٹیبل پر سے اٹھ آیا۔

کچن میں جا کر اپنے لئے کوفی بنائی۔ اور واپس لِونگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔

کوفی کا آخری گھونٹ لیا ہی تھا۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''Yes, come in.'' اُس نے کہا۔ شاید بیرا برتن لینے آیا تھا۔

مگر --- اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کہ بیرے کی جگہ دروازے میں پاس والے سویٹ کی لڑکی صدف کھڑی تھی۔

وہ گڑبڑا سا گیا۔ کپ میز پر رکھا۔ اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہائے زوار صاحب۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

اُس نے یقیناً ریسپشن سے اُس کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔ اُس نے منیجر کو اعتماد میں لیتے ہوئے احتیاطاً وہاں اپنا نام زوار ہی لکھوایا تھا۔ پاکستان میں ابھی اُسے کوئی خاص نہیں جانتا تھا۔ اور یہی اُس کے لئے سودمند ثابت ہو رہا تھا۔ ورنہ جانا پہچانا جرنلسٹ ہوتا۔ تو ہیزل اُس کے پاس بھی نہ پھٹکتی!

''ہیلو''۔ وہ آہستہ سے بولا۔

''میرے آنے پر آپ کو حیرت ہوئی ہے۔ ہے نا؟''

''کوئی کام تھا؟'' اُس کی معنی خیز سی نظریں نظر انداز کرتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

''ہاں''۔

''جی۔ بتائیے''۔

''مجھے بیٹھنے کو نہیں کہیں گے؟'' وہ بالکل یوں بولی۔ جیسے اُسکے ساتھ اُسکی پرانی بے تکلفی تھی۔

''آپ کام بتائیں۔ کیا کام تھا آپ کو''۔

وہ خود ہی آرام سے اُس کے قریب والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ لاچار وہ بھی پھر سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کام نہیں تھا۔ بس دل چاہتا تھا آپ سے باتیں کروں''۔

زار نے سرزنش کے انداز میں سر ہلایا۔

''رات کے گیارہ بجنے کو ہیں۔ اچھا نہیں لگتا۔ آپ پلیز اپنے سویٹ میں جائیں''۔ اُس نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

''آج آپ مجھے اُس دن کی طرح ٹرخا نہیں سکتے۔ میں نہیں جاؤں گی''۔ وہ

سیٹ پر مزید relax ہوتے ہوئے بولی۔

''دیکھیں۔ بیرا آتا ہوگا۔ بری بات ہے...''

''میں اپنا اچھا بُرا خود سمجھ سکتی ہوں''۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن — بات صرف آپ کی نہیں۔ میری بھی ہے''۔

''اوہ... تو آپ کو اپنی فکر ہے''۔

''ہاں۔ مجھے اپنی فکر بھی ہے''۔ اُس نے 'بھی' پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا رہنے دیں''۔ وہ لاپروائی سے بولی۔ ''اتنی دیر میں ہم کوئی اور بات بھی کر سکتے تھے''۔

''او کے۔ آپ نے جو کہنا ہے جلدی سے کہہ دیں''۔

''جلدی سے کیوں؟ رات تو ابھی پوری پڑی ہے۔'' اُس نے اپنا سر اُس کے کندھے پر رکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''رات باتوں کے لئے نہیں ہوتی''۔ اُس نے اُس کا سر اپنے کندھے سے ہٹا لیا۔ ''سونے کے لئے ہوتی ہے''۔

''نہیں۔ رات سونے کے لئے نہیں ہوتی''۔ وہ دوبارہ اُسکے بازو سے لگ گئی۔ اُس کا لہجہ ہیجان انگیز اور آنکھوں میں عجیب سی دعوت تھی۔

''رات صرف آرام کرنے کے لئے ہوتی ہے''۔ ایک بار پھر اُس نے اُسکو خود سے الگ کر دیا۔ وہاں سے اٹھتے ہوئے کونے میں ڈائننگ چیئر پر بیٹھ گیا۔

وہ بھی صوفے سے اٹھتے ہوئے پاس چلی آئی۔ دوسری چیئر نکالتے ہوئے کرسی کے ساتھ ساتھ زار پر بھی ڈھیر ہو گئی۔ بالکل جیسے نشے میں تھی!

کیا ڈھیٹ لڑکی تھی۔ کوئی دیکھ لیتا تو کیا سوچتا اُسکے بارے میں؟

"دیکھو۔ تم حد سے بڑھ رہی ہو"۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے بھی کھڑا کیا۔"
پلیز اپنے سویٹ چلی جاؤ"۔

"کیوں چلی جاؤں؟" اُس کی نظریں زار کے کسرتی بدن کے آر پار ہو رہی تھیں۔

"اِس لئے۔ کہ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔"

"اوہ... یہ آپ کہہ رہے ہیں؟" وہ گہرے طنزیہ لہجے میں بولی۔

"ہاں۔ میں کہہ رہا ہوں"۔ اُس کا لہجہ بھی مستحکم تھا۔

"تو... پچھلی رات بارہ بجے سے لیکر صبح چار بجے تک اُس لڑکی کے ساتھ سب اچھا لگ رہا تھا؟"

اوہ — تو وہ ہیزل کو رات بارہ بجے اُسکے سویٹ میں آتے اور پھر صبح چار بجے اُسکو ہیزل کے ساتھ جاتے دیکھ چکی تھی!

پل بھر کو وہ گڑبڑا سا گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے خود کو سنبھال لیا۔

"وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اور میں اپنے ذاتی معاملات میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں دیتا۔ You better leave now." اُس نے سختی سے کہا۔

وہ زخمی ناگن کی طرح نظر آنے لگی۔ عجیب انداز میں مسکرائی۔

"تم کل اِسلام آباد واپس جا رہے ہو نا مسٹر زوار؟"

یہ سب بھی اُس نے ریسیپشن سے ہی پتہ کیا تھا۔ وہیں تو اُس نے نام اور جگہ بدل کر لکھوائے تھے۔ صرف اُنہیں ہی پتہ تھا کہ وہ کل ہوٹیل چھوڑ کر جانے والا تھا۔ اُسے اور بھی بُرا لگا۔

"تمہیں اِس سے کیا؟"

"کچھ نہیں"۔ اُس نے بڑی ادا سے کندھے اچکائے۔

"And now please go away." آگے بڑھتے ہوئے اُس نے اُس کے لئے دروازہ کھول دیا۔

وہ کھٹ پٹ کرتی چلی گئی۔ اور —

زار مفلوج سا ذہن لئے اپنے بیڈروم میں آ کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

اور جھمیلے کیا کم تھے کہ یہ ڈھیٹ سی لڑکی بھی پریشان کرنے لگی تھی۔ بلیک میل کر رہی تھی جیسے!

تبھی — اُس کا سیل فون بج اٹھا۔ ہیزل تھی۔

"کیا کر رہے ہیں سر؟" اُس کی اپنی اپنی سی آواز اُس کے کانوں میں رس گھولنے لگی۔

"کچھ نہیں۔ بس بستر پر جانے کا سوچ رہا تھا۔" وہ گزرا ہوا واقعہ پسِ پشت ڈالتے ہوئے بولا۔

"میں سمجھ رہی تھی آپ میرے بارے میں سوچ رہے ہیں"۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ بوجھل سی مسکراہٹ!

"کیا بات ہے؟ کچھ بجھے بجھے سے لگ رہے ہیں"۔

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے"۔

"پھر کیسی بات ہے؟"

وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ اب کے کچھ خوشگواری تھی مسکراہٹ میں۔

"بات ایسی ہے کہ مجھے ایک لڑکی سے پیار ہو گیا ہے۔ مگر وہ — اتنی میجسٹک ہے، اتنی رعب داب والی۔ کہ پاس جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے..."

''پوچھ سکتی ہوں کہ وہ کون ہے؟''

''تم''۔ وہ براہِ راست بولا۔

''اوہ— مگر میں تو یکدم ایک غریب سی عاجز سی لڑکی ہوں۔''

اُس نے گہری سانس لی۔ ابھی کچھ دیر پہلے صدف نے ہیزل کے لئے کتنی فضول بات کی تھی؟ گوڈ!

وہ پھر سے الجھنے لگا۔

''ہیزل''۔

''جی''۔

''میرے پاس آؤ نا''۔

''کیوں؟'' وہ مسکرادی۔

''میں بہت، بہت تھکا ہوا ہوں۔''

''سر دبادوں؟''

''نہیں''۔ اُسے ہنسی آگئی۔

''کوفی بنادوں؟''

''نہیں''۔

''پھر؟''

''کچھ سمجھ نہیں آرہی''۔

''آجاؤں؟''

''نو'' اُس نے سختی سے کہا۔

''ابھی تو آپ کہہ رہے تھے میرے پاس آؤ''۔

''میں ویسے کہہ رہا تھا۔ تمہیں رات کے اِس پہر بلاؤں گا؟''

''کل بھی تو آئی تھی اِس وقت''۔

''وہ الگ بات تھی''۔

''اور اب الگ ہے؟''

''absolutely الگ''۔

''اچھا؟''

''ہاں''۔

''آپ کیا چیز ہیں؟''

''بس ایسا ہی ہوں''۔

''That's why I love you.''

''کیا؟ کیا کہا تم نے؟'' وہ جان بوجھ کر اُسے چھیڑنے لگا۔

''میں نے کہا I love you.'' اُس نے خوشگواری سے دہرایا۔

''پھر کہو''۔

''کیوں سنائی نہیں دیتا کیا؟''

''نہیں۔ اتنا شور ہے یہاں''۔

''کس چیز کا؟''

''دریا کا''۔ وہ آرام سے بولا۔

اور ہیزل بے اختیار ہنس دی۔ دریا اُس سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اُس کا شور اُس تک بالکل نہیں پہنچ سکتا تھا۔

''اچھا اب بند کرتی ہوں۔ دریا کے شور میں آپ ویسے بھی نہیں سنیں گے''۔ وہ

بھی اُسے تنگ کرنے لگی۔

''دریا یہاں کہاں؟'' اُس نے اچانک پٹڑی بدلی۔

ایک بار پھر — وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

اُس کی ہنسی میں جادو تھا۔ وہ مسحور ہو کر رہ گیا۔

''سر!''

''ہوں۔''

''میں فون بند کرنے لگی ہوں''۔

''کیوں؟''

''آپ جو چپ سے ہو گئے ہیں''۔

''میں تمہاری ہنسی کی بازگشت میں کھو گیا تھا''۔

''اوہ۔ ویسے آپ نے اپنی ہنسی پر غور کیا ہے کبھی؟''

اُس کی دلآویز ہنسی اُس کے جاندار قہقہے اُسے بھی تو پہروں مسمرائیزڈ رکھتے تھے۔

''نہیں''۔

''وقت ملے تو ضرور دھیان دیں''۔

''وقت ہی تو نہیں ملتا''۔

''کیوں؟''

''تمہاری سوچیں پیچھا چھوڑیں تو وقت نکالوں''۔

''ایسی بات ہے؟''

''ہاں''۔

''میں اپنی سوچیں اپنے پاس بلالوں گی''۔

''اور میں نے اپنی سوچیں اپنے پاس بلالیں تو؟''

''آپ ایسا نہیں کریں گے''۔ وہ جلدی سے بولی۔

''تو تم کیوں ایسا کہہ رہی ہو؟'' اُسے بھی اُس کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

''اچھا سوری''۔

"And now say, you love me."

"I love you."

"I love you too."

''اب... اجازت دیں گے؟''

"Take care — Good night." اُس نے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

حسب معمول وہ آج بھی صبح صبح جوگنگ کے لئے نیچے سڑک پر آ گیا۔ پھر چلتا چلا گیا۔

سامان اُس نے رات کو ہی پیک کر لیا تھا۔ بس واپس ہوٹیل جا کر ناشتہ کرنا تھا۔

اور پھر— گھر کے لئے چل پڑنا تھا۔

اُسے ہیزل آج پہلے سے کئی گنا زیادہ یاد آ رہی تھی۔ کہ اتنے دن تو اُسے تقریباً روزانہ دیکھ لیتا تھا۔ مل لیتا تھا۔ باتیں کر لیتا تھا۔ مگر— آگے کیا ہونا تھا؟ کتنے مرحلے ابھی باقی تھے؟ یہ سوچ کر وہ اَپ سیٹ ہو رہا تھا۔

نیلگوں آکاش پر بادلوں کا پہرہ تھا۔ شبنمی ہریالیاں خوشبوئیں بکھیر رہی تھیں

اور— دُور پار کے جزیروں سے آتی ہوائیں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

سڑک سنسان تھی۔ پگڈنڈیاں ساکت اور— زندگی سوئی سوئی!

ایسے میں اچانک ایک گاڑی اُس کے پاس آ کر رُکی۔ چار بندے اُس میں سے نکلے۔ زبردستی اُسے گاڑی میں ڈالا۔ اور— روانہ ہو گئی۔

اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کہ وہ لوگ کون تھے؟ اُسے کہاں اور کیوں لیجا رہے تھے؟

”کیا ذوالفقار شاہ نے کروایا تھا ایسا؟ پہلا خیال اُسے اُسی کا آیا۔ کیا کامران کی حرکت تھی یہ؟ دوسرا خیال اُسے اُس کا آیا۔ یا پھر— آجکل پورے ملک میں دندناتے پھرتے دہشت گرد؟ جو کسی کو بھی بغیر کسی وجہ کے اُٹھا کر لے جا سکتے تھے۔ پر—

جو بھی تھا، جو کچھ بھی تھا۔ وہ گِھر چکا تھا۔ وہ ایک اور اغوا کار چار تھے۔

اُسے ہزاروں وسوسوں نے آن گھیرا تھا۔ امی اور نانو کے بارے میں خیال آ رہا تھا۔ ہیزل کے بارے میں بھی۔ کہیں یہ لوگ امی اور نانو تک نہ پہنچ جائیں۔ ہیزل کو نقصان نہ پہنچائیں۔

عجب بے بسی تھی۔ اُنہوں نے اُس کے ہاتھ منہ تو کیا باندھ رکھے تھے، آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی تھی۔ اُسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ لوگ کس سمت جا رہے تھے؟

اُس کا سیل فون بھی ہوٹیل میں رہ گیا تھا۔ لیکن وہ اُس پر کسی کو اپنے بارے میں بتا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ ایک تو اُس کے ہاتھ بندھے تھے۔ دوسرے وہ لوگ اُس سے فون چھین بھی سکتے تھے۔ اسی میں شاید بہتری تھی۔ کہ — اُس میں اُس کے کئی کونٹیکٹ نمبرز وغیرہ تھے۔ جن سے ان کو اُس کے بارے میں hints مل سکتی تھیں۔

اپنا پروفیشن تو اُس نے سوائے ہوٹیل منیجر کے باقی سب سے چھپا رکھا تھا۔ وہ تو

بہت احتیاط سے بالکل detective بن کر ہیزل اور اُس کے اسٹیٹ کے اِردگرد گھوم پھر رہا تھا۔

سب کچھ معلوم ہوا۔ بلکہ کئی ایسے راز پتہ چلے۔ جو شاید ہیزل کے قریب نہ جانے پر پتہ ہی نہ چل پاتے۔ جتنا وہ اپنی achievements پر خوش تھا۔ اتنا ہی اِس وقت ہر سُو اندھیرے نظر آ رہے تھے۔

وہ لوگ اونچائیوں سے اُترتے ہوئے میدانی علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اِس کا تو اُسے اندازہ ہو رہا تھا۔ مگر کس رخ اور کس موڑ کو کراس کر رہے تھے۔ یہ سمجھ آ رہی تھی۔ بہر حال—

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ کبھی کبھار وہ لوگ آپس میں کوڈ ورڈز میں کچھ کہہ سن لیتے تھے اور بس۔ اور وہ تو تھا ہی خاموش۔ کہ منہ بندھا ہوا تھا اور ہاتھ جکڑے!

قریباً چار گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ لوگ اُسے گاڑی سے اتار کر ایک پرانے ویران اجاڑ بنگلے کے بوسیدہ سے تہہ خانے میں لے آئے۔ اُس کی آنکھیں ہاتھ منہ کھولے۔ اور اکیلا چھوڑ کر دروازہ باہر سے لاک کرتے ہوئے چلدیئے۔

تہہ خانے کے ملگجے سے اندھیرے میں اُس نے دیکھا۔ وہاں ایک بان کی چار پائی تھی۔ اور ایک لکڑی کی پرانی سی کرسی۔ ہاتھ پاؤں ہلا جلا کر قدرے سیدھے کرتے ہوئے وہ چار پائی پر بیٹھ گیا۔

سوچنے کو اَن گنت چیزیں تھیں۔ ذہن میں لامتناہی سوال!

مگر— سننے والا کوئی نہیں تھا۔ جواب دینے کو کوئی تیار نہیں تھا!

اُن کے تیور بتا رہے تھے۔ اُن کی کرختگی کہہ رہی تھی۔ کہ نہ وہ کچھ پوچھے۔ اور نہ وہ کوئی جواب دیں گے!

مفلوج سا ذہن لئے بازو سر کے نیچے رکھتے ہوئے وہ چار پائی پر لیٹ رہا۔ نظریں اوپر روشندان پر جما دیں۔

وہ اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے؟ مار دینے والے تھے؟ تشدد کرنا تھا؟ یا پھر یہ اغوا برائے تاوان تھا؟

شام ڈھل رہی تھی۔ وہ اِسی طرح بھوکا پیاسا پڑا تھا۔ نہ کوئی اندر آیا تھا۔ نہ آس پاس کسی کی موجودگی کی آہٹ ہوئی تھی۔ ایک باتھ روم تھا وہاں۔ مگر اُس کے نلکے میں پانی نہیں آ رہا تھا جس سے وہ اپنی پیاس ہی بجھا پاتا۔

اِس وقت بھی وہ کرسی پر بیٹھا تھکی تھکی آنکھوں سے اِردگرد دیکھ رہا تھا۔ یہاں سے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ چھوٹے سے روشندان میں بھی لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔ باتھ روم میں بھی کوئی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔

سوچ سوچ کر ذہن جواب دینے لگا تھا کہ —

اچانک دروازے کے پاس قدموں کی آہٹ ہوئی۔ دروازہ کھلا۔ وہی غنڈوں کی شکلوں والے بندے جو اُسے یہاں لے کر آئے تھے۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے آئے اور — اُسے بے تحاشا پیٹنے لگے۔

اُس نے پوچھا بھی۔ کہ اُس نے کیا قصور کیا تھا۔ کیوں وہ اُسے اِس بے دردی سے مار رہے تھے۔ مگر — وہ صرف ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے۔ زبان سے کچھ نہیں بول رہے تھے۔

شروع میں تو وہ اُن کے وار بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر پھر — سمجھ گیا۔ جتنی وہ مزاحمت کر رہا تھا۔ اتنا ہی وہ شدت پکڑ رہے تھے۔ پھر — چار اور ایک کا مقابلہ بھی کیا۔ وہ اُسے پیٹتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ بے سدھ ہو کر گر پڑا۔

اُنہوں نے اب بھی اُسے نہیں چھوڑا۔ وحشیوں کی طرح جوتوں سے اُسے کچلتے رہے۔ وہ بالکل بے جان ہوگیا۔ تو اُسے ٹھوکر لگاتے ہوئے واپس چلدیئے۔ ایک بار پھر باہر سے تالا لگا گئے۔

کافی دیر یوں ہی فرش پر پڑے رہنے کے بعد اُس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اُس کا شاید بازو ٹوٹ گیا تھا۔ ہاتھ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ بہر حال—

دوسرے ہاتھ سے بازو کو سہارا دیتا۔ گرتا پڑتا، وہ چارپائی تک آ ہی گیا۔ اُس پر ڈھیر ہوگیا۔ پھر اُسے پتہ ہی نہیں چلا۔

اُس کی آنکھ کھلی۔ تو صبح ہو رہی تھی۔ دن کا مدہم اجالا روشن دان میں سے چھن چھن کر تہہ خانے میں آ رہا تھا۔ چڑیوں کی چہکار زندگی کا پتہ دے رہی تھی۔

اُسے لگا اُس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ مگر ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی۔ تو تلخ حقیقت سامنے آ گئی۔ اُس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ لگتا تھا ہر ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔

تبھی دروازہ کھلا۔ اور ایک آدمی پرانی میلی سی ٹرے میں چائے دانی اور پیالی رکھے سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا۔

وہ شاید اُسے چائے دینے آیا تھا۔ اُس کا رواں رواں زخمی تھا۔ چائے کسی نعمت

سے کم نہیں تھی۔ اُس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ کرسی کی مدد لینا چاہی۔ مگر واپس چارپائی پر جا پڑا۔

وہ پکی عمر کا بھلا آدمی لگ رہا تھا۔ کرسی میں ٹرے رکھی۔ اور اُسے بیٹھنے میں مدد دی۔

''یہ چائے پی لو۔ روٹی بھی ہے۔ کھالو''۔ اُس کے لئے پیالی میں چائے ڈالتے ڈالتے وہ کہہ رہا تھا۔

''تم کون ہو؟'' وہ اُسے ممنون نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''میں یہاں کا چوکیدار ہوں''۔

''یہ— کون لوگ ہیں؟''

''بس۔ تم چائے پی لو۔ اور زیادہ نہ پوچھو''۔

گرم روٹی اور گرم چائے کسی خزانے سے کم نہیں تھے۔ بھوک پیاس سے بے حال وہ آہستہ آہستہ کھانے لگا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟ اُس نے پھر سوال کیا۔

''نیک محمد''۔

''بہت اچھا نام ہے''۔

وہ چند پل خاموشی سے چائے پیتا رہا۔

''تمہارا مالک کیا یہیں رہتا ہے؟'' اُس نے پھر پوچھا۔

''نہیں۔ میں نے آج تک اُس کو دیکھا ہی نہیں''۔

''تمہیں کچھ پتہ ہے یہ لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟''

''نہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ مگر یہ اکثر کسی نہ کسی کو یہاں لاتے رہتے ہیں۔

مارتے پیٹتے ہیں۔ کوئی مر جاتا ہے۔ تو ریل کی پٹڑی پر ڈال آتے ہیں۔ بہت ظالم لوگ ہیں۔ کسی کو پانی تک نہیں دیتے۔ میں تمہیں رات کو پیٹتے سنتا رہا۔ صبح میں نے روشندان میں سے دیکھا کہ تم زندہ بھی ہو یا نہیں؟ تمہیں ہلتے جلتے دیکھا۔ تو یہ چائے لے آیا۔ خدا ہی تمہاری حفاظت کرے''۔

''یہاں سے نکل بھاگنے کا کوئی راستہ ہے؟'' اُسے اپنے حق میں پا کر اُس نے پوچھ ہی لیا۔

''بظاہر تو کوئی راستہ نظر نہیں آتا...''

''تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟''

''نہیں صاحب۔ یہ لوگ مجھے تو کیا میرے پورے خاندان کو مار ڈالیں گے۔'' وہ سہم کر بولا۔

''اوہ۔'' اُس نے اتنا ہی کہا۔ پھر سے اپنی چائے پینے لگا۔

''یہ لوگ... لوگوں کو اغوا کرتے ہیں۔ مار پیٹ کر مار ڈالتے ہیں۔ اِن کا کسی کو پتہ نہیں چلتا؟'' اُس نے ایک بار پھر پوچھا۔

''یہ بہت طاقتور لوگ ہیں۔ کسی کو پتہ چلتا بھی ہوگا تو خاموش ہو جاتے ہوں گے''۔

''اوہ۔ ویسے یہ ہے کون سی جگہ؟ میرا مطلب ہے کون سا شہر ہے؟''

''صاحب مجھ سے اور مت پوچھو۔ میں بہت غریب آدمی ہوں...''

''ٹھیک ہے۔ تم فکر مت کرو۔'' اُس نے چائے کا آخری گھونٹ لیا۔ اور کپ ٹرے میں رکھ دیا۔'' تمہاری ہمدردی میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔'' پھر وہ تلخی سے مسکرایا۔ ''اگر میری زندگی رہی تو''۔

''مایوس نہیں ہوتے صاحب۔'' وہ برتن اٹھانے لگا۔ ''مایوسی گناہ ہے''۔

وہ چلا گیا۔ اور زار باہر سے لاک ہوتے دروازے کو دیکھنے لگا۔

پھر— اٹھا اور آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے کی کوشش کرنے لگا۔ کہ جسم کچھ ہلے جلے۔ بلڈ سرکولیشن ہو۔ اور اُس میں کچھ توانائی آئے۔

اُس کی جینز اور شرٹ جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ خون اور مٹی الگ جمی ہوئی تھی۔

گرم چائے اور روٹی نے اُسے بحال ہونے میں خاصی مدد دی۔ وہ قدرے چل پھر سکا۔

لڑکھڑا لڑکھڑا کر چلتے اُس نے اِردگرد نظر ڈالی۔ بوسیدہ سا تہہ خانہ جیسے گودام بھی تھا۔ ایک کونے میں ایک پرانا رول کیا ہوا قالین رکھا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی میز تھی۔ پودوں کو پانی دینے کا فوارہ تھا۔ رسی کا ٹکڑا تھا۔ اور— اِن سب پر جمی بے شمار مٹی تھی۔

وہ جلدی ہی تھک گیا۔ دوبارہ چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔

گزرتے لمحوں کے ساتھ اُس کا ذہن تیزی سے اُدھیڑبُن میں مصروف تھا۔ کیسے نکلے گا اِس قید سے؟

چھوٹے سے روشندان میں موٹی سلاخیں گڑھی تھیں۔ باتھ روم میں بھی کوئی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔ صرف ایک راستہ تھا۔ کہ اگر یہ چوکیدار دوبارہ آیا۔ تو دروازے کے پیچھے سے اُس پر وار کر کے کھلے دروازے سے نکلا جا سکتا تھا۔

ہاں— وہ ایسا ہی کرے گا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خود کو ملامت کرنے لگا۔ وہ تو اُس کے ساتھ بھلائی کر رہا تھا۔ اور وہ اُسے نیچے گرا کر فرار ہو کر اُسے اپنے مالک سے قتل کروا رہا تھا۔

سوچ سوچ کر اُس کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ کوئی اُمید کوئی روشنی کی کرن نظر

نہیں آرہی تھی۔

ایک بار پھر وہ دائیں بازو کا سہارا لیتے ہوئے اٹھا۔ کتنی تکلیف ہو رہی تھی اُسے ہلنے جلنے میں۔ کتنی نقاہت محسوس ہو رہی تھی اُسے اٹھنے بیٹھنے میں۔ بمشکل چلتے چلتے اُس نے اپنا بایاں بازو چیک کیا۔ سوجھا ہوا اور بے تحاشا درد کر رہا تھا۔ یقیناً فریکچر ہوا تھا۔ بے جان بھی تھا۔ دوسرے ہاتھ سے سہارا دینا پڑ رہا تھا۔

کیا آج وہ لوگ پھر آئیں گے؟ کیا دوبارہ اُس پر طبع آزمائی کریں گے؟ کیا باقی لوگوں کی طرح جان نکال کر ریل کی پٹڑی پر ڈال آئیں گے؟

نو— اُسے کچھ کرنا ہوگا۔ یہاں سے نکلنا ہوگا۔ یوں آسانی سے خود کو ضائع نہیں ہونے دیگا۔ اُس کی ماں اور نانی اُس کی منتظر تھیں۔ ہیزل کا بھی اُسے خیال آرہا تھا!

ایک بار پھر زخموں سے چور چارپائی پر لیٹا۔ تو غنودگی نے آلیا۔

تبھی— دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اور اُس کی آنکھ کھل گئی۔

وہی چوکیدار تھا۔ نیک محمد۔ اُس کے لئے شاید کھانا لایا تھا۔ ایک ہاتھ میں چنگیر دوسرے میں پانی کا گلاس لئے تہہ خانے کی سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔

وہ کل کا پیاسا تھا۔ چارپائی میں بیٹھتے ہوئے ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ پھر کھانا کھانے لگا۔ نیک محمد کبھی پاس آ کر بیٹھتا کبھی باہر جا کر جھانکتا۔ کہ کوئی آ تو نہیں رہا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ذہنی طور پر بے تحاشا پریشان سہی۔ اُسے نیند نے آلیا۔

مچھروں نے یلغار کر دی۔ تو اُس کی آنکھ کھل گئی۔ تہہ خانے میں ملگجا اندھیرا چھا گیا تھا۔ باہر شام کے دھندلکے گھر آئے تھے۔

اُس کے پاس گھڑی بھی نہیں تھی۔ ہوٹیل میں چھوڑ آیا تھا۔ اُسے وہاں اپنے

سامان کی اور گاڑی کی بھی فکر ہو رہی تھی۔ اِن لوگوں کو اُس کے سامان سے پتہ چل جاتا کہ وہ ایک صحافی تھا۔ تو پھر یقیناً اُسے زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔ کہ اِس قسم کے مجرم صحافیوں کو اپنا اولین دشمن سمجھتے تھے۔ بہر حال ـــ

وہ اُٹھکر بیٹھ گیا۔ پھر سے آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ کہ جتنا ہلتا جلتا اُتنا ہی اچھا تھا۔

تبھی ـــ دھڑام سے دروازہ کھلا۔ اور ـــ

اُس میں سے کامران نمودار ہوا۔ اکیلا تھا۔ کوئی اور ساتھ نہیں تھا!

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اُس کا خیال درست تھا۔ اِس کڈنیپنگ کے پیچھے کامران کا ہی ہاتھ تھا!

بڑی سی توند، چھوٹا سا قد اور سر پر چند بال ـــ اُسے اور بھی حقارت محسوس ہوئی۔

نیک محمد کہتا تھا کہ اُس نے اپنے مالک کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ لیکن آج وہ آ گیا تھا۔ کہ وہ شاید اپنے رقیب کو دیکھنا چاہتا تھا!

بڑے سٹائل سے وہ سیڑھیاں اترا۔ زور سے کرسی کھینچی۔ اُس پر بیٹھا۔

''تو تم ہو زوار؟'' وہ فاتحانہ انداز میں بولا۔

زار چونکا۔ اپنا نام 'زوار' اُس نے ہوٹیل میں لکھوایا تھا۔

کھڑے کھڑے ہی وہ خاموشی سے اُسے تکتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔

''ہیزل کو کتنا جانتے ہو؟'' اُس نے سوال کیا۔

بہت مشکل سوال تھا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''بتاؤ کب سے جانتے ہو اُسے؟'' اُسے گھورتے ہوئے وہ مزید بولا۔

''جب سے ہِل سٹیشن پر گیا تھا''۔ اُس نے کہہ ہی دیا۔

''تمہارا اُس کے ساتھ کس حد تک تعلق ہے؟''

''ہل سٹیشن پر اُسے سبھی جانتے ہیں۔ میں بھی جاننے لگا...'' وہ حقیقت نہیں بتا سکتا تھا۔ کہ ہیزل کی بدنامی ہوتی تھی۔ اور خود اُس کو موت کا سامنا کرنا تھا۔

''بس... اِتنا ہی ہے؟'' وہ گہرے طنز سے بولا۔

''ہاں''۔

''لیکن مجھے تو گارڈ نے بتایا تھا۔ کہ تم گھر کے اندر تک جاتے رہے ہو؟''

''وہ مشکل میں تھی۔ اُس کی مدد کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ اُس کے لئے چاہے گھر کے اندر جانا پڑتا...''

''میں مان سکتا ہوں کہ وہ کس مشکل میں تھی؟''

''اُس کے بیڈروم میں کوئی شخص غلط اِرادے سے گھس گیا تھا۔'' اُس نے کہہ ہی دیا۔ کہ اِس وقت اُسے اُس سے شدید نفرت ہو رہی تھی۔

''اوہ''۔ وہ کچھ گڑبڑایا۔ پھر سنبھلا۔ ''اور اُس کے بعد وہ تمہارے پاس صبح کے چار بجے تک تمہارے سویٹ میں رہی؟''

زار کا بھی رنگ بدل سا گیا۔ کہ بات جو بھی تھی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ تھی کہ وہ اُس کی منگیتر تھی!

''مجھے صدف نے سب بتا دیا ہے۔ جب مجھے ہیزل کے گارڈ سے تمہاری ہل سٹیشن پر آمد اور ہیزل سے تمہاری ملاقاتوں کی اطلاع ملی۔ تو میں نے صدف کو تمہارے قریبی سویٹ میں ٹھہرا دیا۔ کہ وہ تمہاری ہر حرکت پر نظر رکھے۔ اور پھر میں خود بھی گیا تمام حالات جاننے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں ضروری کام سے واپس چلا آیا...''

تو ـــ اُسے یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ فون اُس نے ہی اُسے کروایا تھا۔ جبکہ

خودزار کو بھی یہ علم نہیں ہوسکا تھا۔ کہ صدف اُسی کے کہنے پر اُس پر نگاہ رکھے تھی!

وہ خاموشی سے اُسے تکتا رہا۔ کہتا بھی کیا؟ کہ وہ پہلے ہی سب جان چکا تھا۔

''بولو''۔ وہ اٹھکر اُس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ ''جواب دو۔ رات بارہ بجے سے لیکر صبح کے چار بجے تک تم کیا کرتے رہے؟'' وہ اُسے گھورے جارہا تھا۔

''کچھ نہیں۔'' اُس نے مختصراً کہا۔

''کچھ نہیں؟'' اُس نے زور سے اُس کے پیٹ میں گھونسہ مارا۔

''کچھ نہیں؟'' ایک بار پھر کہتے ہوئے اُس نے اُسے مارنے کو ہاتھ اٹھایا۔

تبھی — زار نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سختی سے۔

''Stop it, you—coward.'' اُس سے مزید برداشت نہیں ہورہا تھا۔ انجام چاہے کچھ بھی ہوتا۔ ''رات چار آدمیوں کو بھیج کر تم نے اپنی بزدلی دکھائی۔ اِس وقت تم بھی اکیلے ہو اور میں بھی۔ اب کوشش کر دیکھو مجھے مارنے کی۔'' جانے کہاں سے اُس کے جسم میں طاقت بھر گئی تھی۔ آواز میں گرج عود کرآئی تھی۔

''اوہ — تو تم مجھے مارو گے؟''

اور زار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک بھرپور وار اُس کے منہ پر رسید کردیا۔

''ہاں۔ میں تمہیں ماروں گا۔'' وہ انجام بھول بھال گیا۔

کامران بھی اُسے مارنے لگا۔

''میں جلدی ہی ہیزل سے نکاح کرنے والا ہوں۔ پھر میں اُس کو کیا مزا چکھاتا ہوں۔ یہ اُسے شادی کے بعد پتہ چلے گا۔ اور تم ... تمہیں تو میرے آدمی مار مار کر آج ہی ختم کردیں گے ...'' اُسے مارتے مارتے وہ کہتا گیا۔

زار زخمی اور کمزور ہونے کے باوجود کامران پر بھاری تھا۔ اُس کے ایک وار کے

جواب میں اُسے دس دس مارے۔ برق کی سی طاقت عود کرآئی تھی جسم میں۔ کہ — ایسا نہ کرتا تو موت سامنے کھڑی اُسے دبوچنے کو تیار تھی۔

کامران بے حال ہوگیا۔ تو اُس نے اُسے چارپائی پر دھکیلا اور کونے میں رکھی رسی اٹھا کر اُس سے اُسے چارپائی سے باندھ دیا۔ اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور — سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دروازے سے باہر نکل آیا۔ دروازہ بند کیا اور وہیں لٹکتا تالا لگا دیا۔

اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ ایکڑوں پر پھیلا اُجاڑ ویران سائیں سائیں کرتا بنگلہ تھا۔ اور بس!

اُسے نیک محمد بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ وہ دور لکڑی کے پرانے سے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ بہت تیزی سے۔ کہ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

گیٹ سے نکل ہی رہا تھا کہ نیک محمد پیچھے سے بھاگتا ہوا آپہنچا۔

''یہ تھوڑی سی رقم ہے۔ رکھ لو۔ کام آئے گی۔ غریب ہوں نا۔ بس یہی کچھ ہے''۔ نیک محمد بولا۔

نیک محمد سب دیکھ اور سن چکا تھا۔ یہ البتہ اب بھی نہیں جانتا تھا کہ زار سے لڑنے والا کامران تھا۔ اُس کا مالک۔ اور جانتا بھی تو شاید ایسا ہی کرتا۔

زار نے دیکھا۔ پچاس پچاس کے تین نوٹ تھے۔ وہ دل کا کتنا امیر تھا!

''نیک محمد۔ میں تمہارا احسان ساری زندگی یاد رکھوں گا''۔

زار کو اندازہ ہوگیا۔ وہ سب دیکھ اور سن چکا تھا۔ اُس کی رہائی میں آدھا ہاتھ نیک محمد کا تھا۔ کہ —

وہ چاہتا تو باہر سے تالا بھی لگا سکتا تھا۔ مالکوں کی خاطر اُس کی فرار کو روک بھی سکتا

تھا۔مگر اُس نے ایسا نہیں کیا۔کیونکہ وہ۔۔۔زار کی رہائی چاہتا تھا۔موت سے بچانا چاہتا
تھا اُس کو!

''یہ رکھ لو۔اور فوراً نکلو یہاں سے۔دائیں طرف جاؤ گے تو پکی سڑک ہے۔رکشہ
وغیرہ مل جائے گا۔اللہ تمہاری حفاظت کرے''۔اُس نے اُسے نوٹ تھمائے اور واپس
مڑ گیا۔

ہیزل کو زار کے فون سے تمام حالات معلوم ہو چکے تھے۔

وہ کراچی ہوسپٹل میں تھا۔وہ بے چین ہو رہی تھی اُسے ملنے کو۔لیکن اُس نے
اُسے آنے سے منع کر دیا تھا۔کہ بقول اُس کے کامران اِن دنوں یقیناً اُس کی حرکات
پر نظر رکھے تھا۔اُس کی ذرا سی لاپروائی سے اُس کی اور نادر کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی
تھی۔

زار کے کہنے کے مطابق ہوٹیل منیجر کو کونٹیکٹ کر کے اُس نے اُسکا سامان نہایت
رازداری سے اپنے کاسل منتقل کروایا تھا۔منیجر نے ہی اُس کی گاڑی بھی ٹرین میں بُک
کروا کر کراچی روانہ کر دی تھی۔

کامران کا فون اب بھی آتا تھا۔ وہی پرانی گھسی پٹی باتیں ہوتی تھیں۔ اُس نے زار کے ساتھ کیا کیا تھا؟ یا وہ ہیزل کے بارے میں کیا اِرادے رکھتا تھا؟ یہ ذکر اُس نے چھیڑا ہی نہیں۔

اُسے یہ بھی حیرت تھی کہ جن ملازموں پر اُسے اندھا اعتماد تھا۔ اُن میں سے کوئی ایک ایسا بھی تھا۔ جو اُس کی ہر خبر کامران کو دیتا رہتا تھا۔

اب وہ محتاط بھی رہنے لگی تھی۔ ہاں اشرف بابا کو بتا دیا تھا سب۔ یہ بھی کہ معلوم کریں کہ وہ شخص کون تھا جو کامران کے ہاتھوں بک چکا تھا۔

اُسے ایک اور بڑی فکر کھائے جا رہی تھی۔ کامران نے زار سے کہا تھا۔ کہ جلدی ہی وہ ہیزل کے ساتھ نکاح کرنے والا تھا۔

کیا کرے گی وہ؟ انکار کرے گی۔ تو ذوالفقار شاہ کو پتہ چلے گا۔ اور اُس کو پتہ چلے گا۔ تو نادر کو...

اِس سے آگے سوچتے ہوئے وہ کانپ کانپ جاتی تھی۔

دن گزر رہے تھے۔ بُرے بھلے۔

گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ٹورسٹس رختِ سفر باندھنے لگے تھے۔ مقامی لوگ حسبِ معمول آنے والی ناقابلِ برداشت سردی سے نمٹنے کے لئے تمام تدابیر کر رہے تھے۔

کامران کا فون گاہے گاہے آتا رہتا تھا۔ مگر عجیب بات تھی۔ کہ اُس نے ابھی تک اُس کے ساتھ نکاح کا ذکر نہیں کیا تھا۔

وہ بھی خوش تھی۔ کہ اِسی میں اُس کی بہتری تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ دھڑکا ہر وقت

لگا رہتا تھا!

زار صحت یاب ہو کر گھر جا چکا تھا۔ اپنی ڈیوٹی پر جانے لگا تھا۔ اُسے دن میں کتنی کتنی بار فون اور میسیج کرتا رہتا تھا۔ وہ اُس کی ہر گھڑی ہر پل سے باخبر رہتی تھی۔

زار بہت احتیاط برت رہا تھا۔ کراچی کے posh علاقے کو چھوڑ کر بمعہ امی اور نانو کے مضافات میں ایک پسماندہ سے علاقے میں شفٹ ہو گیا تھا۔ گاڑی بھی اپنی نہیں امی کی استعمال کر رہا تھا۔ کہ اتنے بڑے حادثے کے بعد محتاط رہنا لازمی تھا۔

''I miss you Hazel.'' ''سمجھ میں نہیں آتا کیسے ملوں تم سے؟'' آج وہ بول ہی پڑا۔

''وہ جو چوری چوری میری ڈھیر ساری تصویریں اتاری تھیں۔ اُنہیں دیکھ لیا کریں''۔ اُس نے اُسے چھیڑا۔

''وہی تو دیکھ دیکھ کر جی رہا ہوں''۔

''اوہ۔ واقعی دیکھتے رہتے ہیں؟'' اُسے یقین نہیں آیا۔

''خود بھی دیکھتا ہوں۔ امی اور نانو کو بھی دکھاتا ہوں...''

''ایسا کیوں کرتے ہیں۔ وہ لوگ کیا سوچتی ہوں گی؟

''وہ وہی سوچ رہی ہیں جو میں سوچ رہا ہوں''۔

''کامران سے ڈر نہیں لگتا؟'' وہ سنجیدہ تھی۔

''اُس کے باپ سے بھی نہیں ڈرتا''۔

''واؤ۔ اور اُس نے مجھ سے نکاح کر لیا تو؟''

''پتہ نہیں کیوں؟ میرا دل کہتا ہے ایسا نہیں ہوگا۔ اب تک جو وہ بولا نہیں۔ تو شاید کوئی رکاوٹ ہے بیچ میں''۔

''اور وہ رکاوٹ دور ہوگئی تو؟'' یہی سوچ سوچ کر تو وہ گھلی جارہی تھی۔

''اچھا چھوڑو اُس کی بات۔'' اُس کا ذکر اُسے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ یہ — الگ بات تھی کہ ہیزل سے اُس کے نکاح کا دھڑکا اُسے بھی لگا رہتا تھا!

''اچھا میں آپ کی بات کرتی ہوں''۔

''یہ ہوئی نا بات''۔

''یہاں تو سردی آچکی ہے...''

''یہ میری بات ہے؟'' وہ بیچ میں ہی بول پڑا۔

''سنیں تو''۔

''ہاں بولو''۔

''برفباری شروع ہوتی ہے تو میں اپنی امی کی کزن آنٹی ناجیہ کے پاس چلی جاتی ہوں۔ سردیاں میں وہیں گزارتی ہوں۔ وہاں موسم بہتر ہوتا ہے ...'' وہ دانستہ چپ ہوگئی۔

''تو میں کیا کروں؟'' وہ بچوں کی طرح روٹھ گیا۔

''آپ ایسا کریں۔ کہ وہاں آجائیں...''

''میں وہاں آسکتا ہوں؟'' اُس کی آواز سے خوشی نمایاں تھی۔

''کیوں نہیں۔ میری آنٹی بہت اچھی ہیں۔ اُنہیں مجھ پر بہت اعتماد ہے۔ اُنہیں معلوم ہے میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھاؤں گی...''

''اُنہیں کامران سے تمہاری منگنی وغیرہ کا پتہ ہے؟''

''سب پتہ ہے۔ یہ بھی کہ وہ اور اُس کا باپ کس قماش کے لوگ ہیں۔ اور یہ بھی۔ کہ وہ دعائیں مانگتی رہتی ہیں کہ کامران سے میرا پیچھا چھوٹے...''

پھر تو میں ضرور آؤں گا۔ اوہ گوڈ — مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں''۔

''ہائے داوے... آپ کو میں اتنی اچھی کیوں لگتی ہوں؟'' اُس نے پھر اُسے چھیڑا۔

''مجھے خود نہیں پتہ''۔

''میں بتاؤں؟''

''بتاؤ''۔

''کیونکہ میں اچھی ہوں۔'' وہ آرام سے بولی۔

''باپ رے۔ اتنی بڑی خوش فہمی؟''

''ہاں''۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

اُسے اُس کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ واحد شخص تھا جو اُسے کچھ بھی کہہ جاتا تھا!

زار چپ تھا۔ اُس کی مسور کن ہنسی میں کھو گیا تھا۔

''صاحب جی''۔

''یَس''۔ وہ حواسوں میں آگیا۔

''میں اچھی نہیں ہوں؟''

''نہیں۔ جبھی تو اتنی اچھی لگتی ہو''۔

''پھر آتے کیوں نہیں ہیں؟'' سب معلوم ہونے کے باوجود وہ بچوں کی طرح مچلی۔

''تم جانتی ہو۔ مجھے اپنے سے زیادہ تمہارا خیال ہے۔ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔

مجھے نادر کی بھی فکر لگی رہتی ہے۔ کسی طرح یہ معاملہ ٹھنڈا ہو۔ تو میں اپنے کام میں آگے بڑھوں...''

''سب پردیسی یہی کہتے ہیں''۔

اور ـــ زار کے جاندار قہقہے گونجنے لگے۔

''یہ ـــ پہاڑی لڑکیاں واقعی بیوقوف ہوتی ہیں...''

اور اب ـــ ہیزل بے اختیار ہنس دی۔

''اچھا اب ایسا کرو۔ اپنے ڈھورڈنگر کی سردیوں کا بندوبست کرو۔ اور جلدی سے اپنی آنٹی کے گھر سدھارو۔''

''کاش میں بھی کوئی غریب پہاڑی لڑکی ہوتی...'' پھر اس کے اتنے جھنجھٹ تو نہ ہوتے!

''اور غریب پہاڑی لڑکی تمہیں دیکھ کر یہی سوچتی ہو تو؟''

''اُس کو نہیں پتہ امیروں کی زندگی میں کتنے مسئلے ہوتے ہیں''۔

''اُن میں سے تو بعض کو پیٹ بھر کر روٹی تک نصیب نہیں ہوتی''۔

ہیزل نے گہری سانس لی۔

''ہاں۔ آپ صحیح کہتے ہیں۔ ہر حال میں شکر کرنا چاہیے''۔

''سوائے کامران سے نکاح کرنے کے''۔

''ہاں۔ اور اب ہاتھ پاؤں ہلائیں ذرا آپ۔ پہلے مجھے آنٹی کے یہاں ملنے آئیں۔ پھر یہ... نکاح وِکاح کا چکر ختم کرنے کی کوشش کریں''۔

خود خاصی مضبوط تھی۔ اِس کے باوجود اُسے اُس کی ہیلپ چاہیے تھی۔ کہ آفٹر آل وہ ایک لڑکی ہی تھی!

''او کے میم۔ اور کوئی حکم؟''

وہ ہنس دی۔ دلآویزی سے۔

''اور یہ کہ... جب تک میں آنٹی کے گھر ہوں۔ آپ بھی وہیں رہیں گے''۔

''تمہاری آنٹی کے گھر؟'' اُس نے اُسے چھیڑا۔

''نو سر۔ کوئی اور جگہ ڈھونڈتی ہو گی''۔

''ٹھیک ہے۔ میں کسی ہوٹل میں رہ لوں گا۔ جوں ہی پہلی برفباری ہو۔ تم چلدینا۔ میں پہنچ جاؤں گا انشاء اللہ''۔

''اور اب میں دن گنتی رہوں گی''۔

''اچھا اب بند کرتا ہوں...''

''نہیں''۔

''پلیز! کوئی بندہ آ رہا ہے آفس میں''۔

''تو آنے دیں''۔

''میں اُس کے سامنے تم سے بات نہیں کر سکوں گا نا''۔

''بات مت کریں۔ میں آپ کی سانسوں کو سنوں گی''۔

''I love you; I adore you.''

''I love you too.'' اور ہیزل نے بادلِ نخواستہ فون بند کر دیا۔

ذوالفقار شاہ کو کامران کے نکاح کی جلدی تھی۔ جبکہ کامران سستی سے کام لے رہا تھا۔ کہ ---

وہ تو سال بھر پہلے ہی اپنی پسند کی ایک لڑکی نوشین سے شادی کر چکا تھا۔ بہت چاہتا تھا اُسے۔ اُس نے اپنے ڈیڈ کا ہیزل سے اُس کے نکاح کا فیصلہ اُسے سنایا تھا تو وہ آتشِ پا ہوگئی تھی۔ اُس سے فوراً طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ ایسی ویسی معمولی لڑکی بھی نہیں تھی۔ کہ وہ جو چاہتا اُس کے ساتھ کرتا۔ بہت بڑے گھرانے کی تھی۔

''ڈیڈ۔ نوشین کسی طرح مان نہیں رہی''۔ آفس میں ہی تھا کہ ڈیڈ کا فون آ گیا۔

''بزدل۔ بیوی کے غلام۔ میں بھی تمہاری ماں کو بہت چاہتا تھا۔ لیکن ... کرنا

پڑتا ہے۔ ہماری بزنس میں جذبات سے نہیں دماغ سے کام لیتے ہیں۔ یہ محبت وحبت سب وقتی چیزیں ہیں۔ اِن فضول باتوں کو لیکر بیٹھ گئے تو کسی کام کے نہیں رہو گے۔ سمجھے''۔

''سمجھ رہا ہوں ڈیڈ۔ مگر...''

''کوئی اگر مگر نہیں۔ فوراً نکاح کرو ہیزل سے۔ اور... اُس ٹورسٹ لڑکے کا کیا بنا جو ہیزل سے ملتا تھا...''

''اُسے تو ایسا مزا چکھایا ہے۔ کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ پھر ہیزل کا رخ نہیں کرے گا۔ بھاگ گیا ورنہ... اگلے دن لاش ہی ملتی اُس کی...''

''اچھا .forget about تم بس جلد سے جلد ہیزل سے نکاح کرو۔ میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا''۔

''اور... نوشین نے طلاق مانگی تو؟''

''تو دیدو۔ وہ زیادہ سے زیادہ کیا لا رہی ہے اپنے ساتھ؟ ایک کوٹھی۔ ایک کار۔ کچھ زمین۔ بس؟''

''But Dad, I love her too.''

''Hey! shut up.'' آئندہ میرے سامنے بزدلی کی باتیں مت کرنا۔ اور سنو۔ جب تک تمہارا نکاح ہیزل سے نہیں ہو جاتا۔ اُس پر سخت چیک رکھنا۔ کہیں وہ لڑکا پھر نہ آ جائے''۔

''ڈیڈ۔ اُس نے جو مار کھائی ہے۔ اُس کے فرشتے بھی وہاں نہیں جائیں گے۔ اُس کو پتہ ہے دوبارہ وہاں گیا۔ تو موت ہی اُس کا انجام ہوگی۔ ویسے میں نے نگاہ رکھی ہوئی ہے۔ آپ فکر مت کریں''۔

کامران بہت عیاش تھا۔ اوباش تھا۔ اِس کے باوجود اپنی بیوی سے محبت میں گرفتار تھا!

باپ کے فون سے سخت الجھن میں پڑ گیا تھا۔ وہ نکاح کر بھی لیتا ہیزل سے۔ اُسے تو بقول ڈیڈ اُس نے صرف اپنا پابند کرتا تھا۔ کوئی تعلق تھوڑی رکھنا تھا۔ جیسے ڈیڈ نے کیا تھا ہیزل کی ماں کے ساتھ۔ لیکن نوشین یہ سب سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی تھی۔ ایک ہی رٹ لگائے تھی کہ ہیزل سے نکاح کیا۔ تو اُس کو طلاق دینی پڑے گی۔

وہ عجیب مصیبت میں گرفتار تھا۔ ہیزل کو اپنائے گا۔ تو نوشین کو کھو دیگا۔ اور یہ اُسے کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں تھا۔ نوشین کو تو اُس کی منگنی کی خبر نہیں تھی۔ ورنہ جانے کیا کر لیتی؟ پر— نکاح، شادی۔ یہ تو چھپ نہیں سکتا تھا۔ کبھی نہ کبھی تو اُسے معلوم ہونا ہی تھا!

باہر کی دنیا میں وہ بہت اکڑ کر چلتا تھا۔ لیکن جانے کیا بات تھی۔ نوشین کے آگے وہ خود کو بالکل بے بس محسوس کرتا تھا۔

نوشین کے علاوہ بھی اُس کی mistresses تھیں۔ پرانی بھی نئی بھی۔ مگر وہ اُس کی بیویاں تو نہیں تھیں۔ بس یہ تو ایک عادت تھی اُس کی۔ اپنے باپ کی طرح!

مسٹریسز کا تو نوشین کو پتہ نہیں چلتا تھا۔ کہ اُن کی بزنس میں لڑکیاں تو ہوتی ہی تھیں۔ پر— نکاح وہ نہیں چھپا سکتا تھا۔ وہ بھی ہیزل کے ساتھ۔ کہ— ہیزل تو خود ایک بہت بڑا نام تھی!

الجھنوں میں گھرا کامران جام پر جام لنڈھا رہا تھا۔

اُسے ہیزل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس نے اگر زار کو کڈنیپ کروایا تھا تو ڈیڈ کے کہنے پر۔ کہ شروع سے ہی ڈیڈ کا حکم تھا۔ کہ ہیزل پر کڑی نگاہ رکھنی تھی۔ کسی اجنبی کو

اُس کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔ اِس کے باوجود جانے کیسے زار اُس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہیزل کے ایک گارڈ کو اُس نے خرید لیا تھا۔ وہ اُس کو ہر بات سے باخبر رکھتا تھا۔

جب اُسے زار کی ہیزل سے ملاقاتوں کا پتہ چلا تو اُس نے صدف کو زار کے ہی ہوٹیل میں رکھوا کر اُس کی جاسوسی پر مامور کر دیا۔ جب صدف نے اُسے بتایا کہ ہیزل رات بارہ بجے زار کے پاس آئی تھی۔ تو اُس نے خطرہ بھانپ لیا۔ ڈیڈ کو بتا دیا۔

ذوالفقار شاہ نے اُسے زار کو ختم کر دینے کا اِشارہ دیدیا۔ کہ بقول اُس کے ہیزل کسی بھی کمزور لمحے میں اُسے اُس کے دھندے کے بارے میں بتا سکتی تھی۔ اور پھر— وہ کامران کی منگیتر تھی۔ اُس کی املاک کا حقدار صرف کامران کو ہی ہونا چاہیے تھا!

مگر— جب اُسے صدف سے معلوم ہوا کہ وہ ایک عام ٹورسٹ تھا اور صرف سیزن کے چند دن گزارنے وہاں آیا تھا۔ تو اُس نے ہیزل سے اُس کی چند روزہ دوستی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ کہ اِن چند دنوں میں ہیزل اُس کے اتنی کلوز نہیں ہو سکتی تھی۔ کہ اُسے ڈیڈ کی سیکرٹس بتاتی۔ ورنہ زار خاصا aggressive لگتا تھا۔ کچھ جانتا ہوتا۔ تو hint دے ہی دیتا۔

وہسکی کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھا۔ اور پیچھے اپنے ریٹائرنگ روم کی طرف چلا۔

''بھاڑ میں جائے ہیزل۔ اور بھاڑ میں جائے وہ لڑکا''۔ قدموں کے ساتھ اُس کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

بے حال سا وہ صوفے پر اوندھا پڑ رہا۔

آفس میں کمپیوٹر کے آگے بیٹھا زار پہاڑ پر گزارے دنوں کے اپنے سارے کام پر نظر دوڑا رہا تھا۔ پھر وہاں اتاری تصاویر پر نظر ڈالی۔

ہیزل کی تصویریں تھیں۔ وہ جو پک نک والے دن پک نک سے پہلے اُس آدمی کے ساتھ چراگاہ میں کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ پھر ٹرین میں جب وہ ایک آدمی کے ساتھ کہیں جا رہی تھی۔

پھر اُس گودام کی تصاویر جہاں فروٹ پروسسنگ ہوتی تھی۔ اُن کریٹس کی تصویریں جن میں افیون کی تھیلیاں فروٹ میں چھپائی گئی تھیں۔ کریٹس پر لکھے ایڈریسز کی تصویریں جہاں وہ بھیجے جا رہے تھے۔ اور پھر — افیون کی چھوٹی چھوٹی

سفید تھیلیوں کی تصاویر!

ہیزل کتنے خوفناک مسائل میں گھری تھی۔ اور — اُس کو اِن مسائل سے نکالنا ناممکن نہیں تو بے حد دشوار ضرور تھا!

اُس نے تھکی تھکی سی سانس لی۔

پھر — ہیزل کی اُن تصویروں کو دیکھنے لگا۔ جو بعد میں اُس نے اُس کو خبر ہوئے بغیر صرف اپنے لئے اتاری تھیں۔ پیاری پیاری سی۔ اپنی اپنی سی۔

کسی سے محبت ہو جانا کتنا حسین جذبہ تھا!

غیر ارادی طور پر اُس کا ہاتھ اپنے سیل فون پر گیا۔ اور — ہیزل کا نمبر ملا لیا۔

''بہت — بہت — یاد آ رہی ہو''۔ اُس نے کہا۔

''آپ اپنا کام نہیں کرتے۔ بس مجھے ہی یاد کرتے رہتے ہیں۔'' اُس نے حسب عادت اُسے چھیڑا۔

''تم مجھے یاد نہیں کرتیں؟''

''نہیں''۔

''میں بھی یاد نہیں کرتا''۔ وہ بچوں کی طرح روٹھ گیا۔

''آپ ہی تو کہہ رہے تھے کہ آپ کو میں یاد آ رہی ہوں''۔

''غلط کہہ رہا تھا''۔

''لیکن مجھے تو آپ ہر سانس کے ساتھ یاد آتے ہیں''۔

''جھوٹ بولتی ہو''۔

وہ بے اختیار ہنس دی۔ ایسا بھی اُسے پہلے کسی نے نہیں کہا تھا۔

''چلیں اب صلح کر لیں''۔

وہ خاموش رہا۔

''اِس وقت میں آپ کو دیکھ سکتی تو کتنا اچھا ہوتا''۔ وہ واقعی اُس کی روٹھی روٹھی شکل دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ اب بھی چپ تھا۔

''اچھا میں بند کرتی ہوں''۔

''نہیں۔'' وہ فوراً بول اٹھا۔

اور وہ خوبصورتی سے ہنس دی۔

''میری ہر سانس میں آپ بس گئے ہیں۔ اِس وقت پہلی برف باری ہو رہی ہے۔ اور مجھے آپ بے حد یاد آ رہے ہیں...''

''برف پڑ رہی ہے؟'' وہ ایکسائیٹڈ سا بولا۔

''ہاں۔ اور میں یہی بتانے آپ کو بس فون کرنے ہی والی تھی۔ کہ کل میں اپنی آنٹی کے گھر جا رہی ہوں۔ آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں۔ آ جائیں''۔

''ٹھیک ہے میں آج ہی چھٹی لیتا ہوں۔ کل میں بھی چل پڑوں گا''۔

''دھیان سے آئیں۔ آپ کا راستہ کافی لمبا ہے''۔ اُس کے لہجے میں care تھی، concern تھا!

زار کو بہت اچھا لگا۔ وہ اور بھی اپنی لگی!

''تم بھی احتیاط کرنا۔ اشرف بابا کو ضرور ساتھ رکھنا''۔

''ہاں۔ اُن کے بغیر تو میں لمبی ڈرائیو پر نکلتی ہی نہیں''۔

''Okay — see you then.'' وہ بند کرنے لگا۔

''Take care.'' ہیزل بولی۔

''You too — Bye.'' اور اُس نے فون کر دیا۔

اُس نے واقعی چھٹی لے لی۔ چار دن کی۔ ایک دن جانا۔ ایک دن واپس آنا۔ اور دو دن وہاں کے لئے۔

آج بہت کام تھا آفس میں۔ تھکا تھکایا شام کو گھر لوٹ آیا۔

شائستہ اور اُن کی والدہ چھوٹے سے خوبصورت ٹیریس میں بیٹھیں اُس کی منتظر تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں گیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ اور اُن کے پاس چلا آیا۔ ملازم اِس دوران میز پر چائے لگا چکا تھا۔

''امی۔ میں کل لاہور جا رہا ہوں''۔ کپ میں چائے ڈالتے ڈالتے وہ گویا ہوا۔

''لاہور؟''

''جی''۔

''کوئی کام ہے وہاں؟''

''بہت اِمپارٹنٹ کام ہے۔'' اُس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''امی... وہ ... ہیزل ہے نا...'' اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ چائے کا کپ اُن کے آگے رکھا۔

''وہ تو ہے۔ مجھے پتہ ہے''۔

''وہ یاد آ رہی ہے''۔

''تو یہ بات ہے''۔

"بس یہی بات ہے"۔

"ہمیں کب ملوا رہے ہو؟" اب کے نانو بولیں۔

"یہی تو مصیبت ہے۔ اتنی دور رہتی ہے وہ۔ نہ خود مل سکتا ہوں۔ نہ آپ لوگوں کو ملوا سکتا ہوں"۔

"چلو خیر ہے۔ تم مل آؤ۔ باقی بعد میں دیکھیں گے"۔ شائستہ بولیں۔

"مجھے تو تم اب لے چلو۔ پسند تو ویسے بھی میں نے ہی کرنی ہے"— نانو نے کہا۔

"نانو"۔ وہ اپنا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ویسے وہ اتنی خوبصورت نہیں ہے۔ جتنی آپ کو اپنے نواسے کے لئے چاہئے"۔

نانو کی کمزوری کا اُسے پتہ تھا۔ بقول اُن کے اُن کا نواسا بہت ہینڈسم تھا۔ اُس کی بیوی بھی بہت خوبصورت ہونی چاہئے تھی!

"ہاں۔ تصویریں میں نے دیکھی ہیں۔ سادہ سے نقوش ہیں..."

"پر اُس کے گال پر ڈمپل بہت خوبصورت ہے"۔

شائستہ بے اختیار ہنس دی۔

"تمہیں پسند ہے تو بس ٹھیک ہے۔ صرف ڈمپل ہی سہی"۔

"صرف ڈمپل ہی کیوں؟ میرے زار جیسی ہونی چاہئے۔" نانو نے احتجاج کیا۔

"صرف ڈمپل نہیں نانو۔ اُس کے اٹھنے بیٹھنے، بات چیت کرنے، بلکہ اُس کا ہر انداز میجسٹی لئے ہے۔ اِس کے باوجود۔ وہ شرمیلی سی بھی ہے۔ باحیا سی بھی..."

"تو... اُس کی شکل نے نہیں اُس کے طور طریقوں نے تمہیں اِمپریس کیا ہے۔" شائستہ بولیں۔

"ہاں امی۔ اُس نے صرف اے لیولز کیا ہے۔ مشکل سے بیس سال کی ہوگی۔

لیکن اُس کے انداز بالکل کسی بااختیار Princess کی طرح ہیں۔ وہ بات کرتی ہے۔ تو لگتا ہے کوئی مختارِ کُل چیز ہے۔ لیکن— اِس کے باوجود— وہ بہت humble ہے۔ اور بہت معصوم بھی..."

"لیکن ہے کون؟ تم نے کبھی بتایا نہیں؟" شائستہ نے پوچھا۔

"بتا بھی دوں تو آپ پہچان نہیں پائیں گی۔ کسی دن ملواؤں گا آپ لوگوں کو اُس سے"۔

اُس نے امی اور نانو کو صرف ہیزل کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ کون تھی؟ ذوالفقار شاہ کون تھا؟ کامران کون تھا؟ اُس نے اُس کو اغوا کیا تھا۔ یہ سب بتا کر وہ اُن دونوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ تو جب ہوسپٹل میں تھا۔ تب بھی دو دن امی اور نانو کو خبر نہیں دی تھی۔ قدرے بہتر ہوا تھا تو اُن کو بلوالیا تھا۔ اُنہیں یہی بتایا تھا کہ اُس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ تفصیل بتا کر وہ اُنہیں فکرمند نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ تو کبھی اپنے پروفیشن کے بارے میں بھی اُنہیں زیادہ نہیں بتاتا تھا۔ کہ انہوں نے اَپ سیٹ ہی ہونا تھا۔

یہاں اِس دوردراز علاقے میں اُنہیں لایا تھا۔ تو یہی بتا کر کہ یہ جگہ اُس کے آفس کے نزدیک پڑتی تھی اور بس۔ وہ لوگ اگرچہ بہت آسائشوں میں رہنے والے تھے لیکن—

جہاں زار خوش تھا وہیں وہ بھی خوش تھیں۔ ایک اکلوتی تو شائستہ کی اولاد تھی۔ وہ دو ہی سال کا تھا۔ جب اُن کے شوہر کا کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا۔ اُن کے انتقال کو دو ہی ہفتے گزرے تھے۔ کہ اُن کے جیٹھ کی نظریں اُنہیں بدلی بدلی نظر آنے لگیں۔

عدت ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ اُس نے اُن سے نکاح کا تقاضا کر دیا۔ بقول اُس کے وہ کم عمر تھیں۔ اگر اُن کی والدہ اُن کی شادی کہیں اور کر دیتیں۔ تو اُس کے بھائی کی واحد نشانی زار کسی اور کے پاس چلا جاتا۔ اور یہ وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ مگر —

یہ بات نہیں تھی۔ اُن کے شوہر کے حصے میں بہت بڑی جائیداد آئی تھی۔ جس کو وہ اُن سے شادی کر کے ہڑپنا چاہتا تھا۔ اور زار کا حق کوئی اور چھینتا۔ یہ وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

سسر اُن کے حیات نہیں تھے۔ ساس بچاری بوڑھی کمزور تھیں۔ تین نندیں تھیں اور جیٹھ تھا۔ نندیں بھی سخت خُو اور جیٹھ تو ساتھ میں خاصا عیاش بھی تھا۔ بہت بڑے زمیندار تھے یہ لوگ۔ وہی جاگیرداروں والی ذہنیت وہی رہن سہن تھی۔ بھائی فوت ہو گیا۔ تو اُس کی جائیداد کے لئے بھابھی سے نکاح کر لینا اُن کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ فریاد کرتیں بھی تو کس سے؟ نندوں کا بھی وہی جواب ہونا تھا۔ جو جیٹھ کا تھا۔ بس —

زار کو لئے راتوں رات گھر سے نکل آئیں۔

وہ لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ، کھاتے پیتے گھرانے سے تھے۔ مگر — بدقسمتی۔ سے والد فوت ہو چکے تھے۔ بھائی تھا نہیں۔ والدہ تھیں اور وہ تین بہنیں۔ بڑی دونوں بہنیں بھی اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ اب صرف وہ تھیں اور اُن کی والدہ۔

جیٹھ آ کر طرح طرح سے پریشان کرنے لگا۔ بس —

سب چھوڑ چھاڑ وہ زار کو لئے اپنی بڑی بہن کے پاس امیریکہ چلی گئیں۔ کچھ عرصہ اُن ہی کے پاس رہیں۔ پھر —

اپنی جاب کرنے لگیں۔ قدم ذرا جما لئے۔ تو الگ اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو کر نئی

زندگی کا آغاز کر لیا۔

تبھی — اُنہوں نے اپنی والدہ کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ ایک تو یہ کہ اُن کی والدہ گھر میں بالکل اکیلی ہوتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ اُن کو بھی بہت ڈھارس تھی اُن کی موجودگی سے۔

وقت یوں ہی گزرنے لگا۔ زار پڑھ لکھ کر ایک مضبوط اور قابل جوان میں ڈھل گیا۔ شائستہ نے دیکھا۔ کہ اب وہ اپنے چچا سے اپنی جائیداد واپس لے سکتا تھا۔ تو —

امیریکہ کو خیرباد کہتے ہوئے وطن واپس آ گئیں۔ اُن کی والدہ بھی اب بوڑھی ہو گئی تھی۔ خود وہ بھی پچاس کراس کر چکی تھیں۔ وطن آنا ہی چاہئے تھا!

زار کا تایا اتنا عرصہ اُس کی جائیداد کھا رہا تھا۔ زار نے آ کر اچانک لوٹانے کو کہا۔ تو حیران و پریشان ہو گیا۔ اب زار کا اُس کے ساتھ بھی مقدمہ چل رہا تھا۔

اپنے پروفیشن کے الگ مسائل تھے۔ اور —

ساتھ میں ہیزل پر بھی دل آ گیا تھا!

شائستہ کو اِس وقت اُس پر بے طرح پیار آیا۔ اپنی سوچوں سے ابھریں۔ مسکرائیں۔

"زار"۔

"جی"۔

"ہیزل تمہیں بہت اچھی لگتی ہے؟" اُن کے لب و لہجے میں زار کے ساتھ ساتھ ہیزل کے لئے بھی پیار کا ایک جہان آباد تھا۔

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ بہت اچھی لگتی ہے۔" وہ حسب عادت ماں کو چھیڑنے لگا۔

''اچھا بہت نہ سہی۔ اچھی تو لگتی ہے''۔

''بس کچھ کچھ''۔

''تو... اتنی دور دراز کے چکر... لگا کر خود کو کیوں تھکاتے ہو''۔

اُس کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا۔

''بس ویسے ہی''۔ اُس نے مسکین سی شکل بنائی۔

''اچھا مجھے تو ساتھ لے چلو''۔ شائستہ نے مزید چھیڑا۔

"Mom — you are the most unromantic mother...."

اور شائستہ اور نانو دونوں ہنسنے لگیں۔

تبھی — اُس کے ایک کولیگ کا فون آ گیا۔ وہ اُس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ تو شائستہ کچن میں چلی گئیں۔ اور نانو نے مغرب کی نماز کے لئے جائے نماز بچھا لیا۔

اِس بار وہ ہیزل سے ملنے plane سے جا رہا تھا۔ کہ کار میں جانے سے اُسے خدشہ تھا۔ کہ کوئی اُس کو follow نہ کرے۔

صبح ساڑھے آٹھ بجے وہ لاہور پہنچا۔ ایک اچھے سے ہوٹل میں چیک اِن کیا۔ ایلیویٹر سے اوپر اپنے کمرے میں گیا۔ گرم پانی کا شاور لیا۔ ناشتہ کیا اور — ہوٹیل کی کار رینٹ کر کے ہیزل کی طرف چل پڑا۔

اِس دفعہ اور — پہلی مرتبہ ہیزل کے پاس جانے میں کتنا فرق تھا۔

تب وہ ایک سمگلر خاتون ہیزل اور اُس کے کرتوت کا پتہ لگانے جا رہا تھا۔ اور اب — ایک مظلوم اور وقت کی ستائی اُس کے دل میں بستی ہیزل سے ملنے جا رہا تھا۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ کار ہیزل کی آنٹی کے گھر کے قریب پہنچنے لگی تھی۔

اُس نے سیل فون پر ہیزل کا نمبر ملایا۔

"I am here, just within a minute's drive."

"شکر ہے آپ خیریت سے پہنچ گئے"۔ اُس کی آواز میں خوشی کی چہکار تھی۔

"اور اب تم گیٹ پر آ جاؤ۔ مجھے اکیلے اندر آتے ہوئے شرم آئے گی۔"

وہ بے ساختہ ہنس دی۔

"شرم... آپ کو؟"

"نہیں واقعی مجھے embarrassment ہو گی تمہاری آنٹی کے سامنے آتے ہوئے"۔

ہیزل نے بھی تو زار کے بارے میں اپنی آنٹی کو سب بتا دیا تھا!

"For your kind information, auntie is not home."

اور — ساتھ ہی کار ہیزل کی آنٹی کے گیٹ پر رک گئی۔

ڈرائیور گاڑی سے اترا۔ کال بیل دبائی۔ جلدی ہی ایک ملازم نے گیٹ کھولا۔ اور وہ گاڑی اندر لے گیا۔

ملازم نے گاڑی گیرج کے پاس رکوائی۔ اور زار کو گائیڈ کرتا اندر لیجانے لگا۔

آنٹی کا چھوٹا سا گھر بہت پیارا تھا۔ ہریالی ہی ہریالی تھی ہر طرف۔ یہاں وہاں دیواروں اور درختوں سے لپٹے پھولدار کریپرز جھونپڑی نما گھر کو مزید حسن بخش رہے تھے۔ ملازم اُسے پچھلی طرف سے اوپر گیسٹ روم میں لے آیا۔

وہ کچھ جھجکتا سا بھی محسوس کر رہا تھا۔ ایک لڑکی سے ملنے اُس کے گیسٹ روم تک

آنا۔ وہ بھی اُس کی آنٹی کے گھر میں!

ہیزل کا بھی کوئی پتہ نہیں تھا۔ نوکروں سے پوچھنا بھی مناسب نہ لگتا تھا۔

بیچ کمرے میں کھڑا اِسی شش و پنج میں تھا کہ دروازے پر ہولے سے دستک ہوئی اور — ہیزل اندر آ گئی۔

مسٹرڈ رنگ کی پلین شلوار قمیض کے ساتھ میچ کرتی پھولدار بارڈر والی شال کندھے پر لئے وہ ہمیشہ کی طرح باوقار لگ رہی تھی۔

وہ چند پل اَڈورنگ نظروں سے اُسے تکتا رہا۔ پھر — بے اختیار دونوں بازو وا کئے اور — ہیزل اُن میں سما گئی۔

ہیزل کو آج پہلی بار احساس ہوا۔ وہ زار کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ آتی جاتی سانس بن گیا تھا وہ اُس کی۔ زندگی تھا اُس کی!

ہیزل کے خوبصورت مہکتے بالوں میں سر دیئے وہ اُس کی سانسوں کو اپنی سانسوں میں مدغم ہوتے محسوس کر رہا تھا، اُس کے دل کی دھڑکنیں اپنی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوتی سن رہا تھا، اُس کے وجود کا لمس اپنے جسم میں منتقل ہوتے feel کر رہا تھا۔

کتنے ہی پل یوں ہی گزر گئے۔ پھر — ہیزل کو ہی احساس ہوا۔ وہ بہت دور سے آیا تھا۔ تھکا ہوا بھی لگ رہا تھا۔ وہ دھیرے سے اُس سے الگ ہو گئی۔

"آپ شاور لیں گے؟ تب تک ناشتہ تیار ہو جائے گا۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"میں نے شاور بھی لے لیا ہے اور ناشتہ بھی کر چکا ہوں..."

ہیزل نے ایک نظر اُس کے سراپے پر ڈالی۔ ڈارک گرے پینٹس اور ایش وائیٹ کوٹ پہنے وہ واقعی نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔ ساتھ ہی بہت stunning بھی!

"اچھا کوفی تو لیں گے نا"۔

"اچھا کوفی تو لیں گے نا"۔

"ہاں۔sure"

ہیزل کچن میں کوفی کا کہنے کو جانے لگی۔

"اے"۔زار نے کہا۔"یہ... تمہارے لئے"۔اُس نے میز پر سے ایک بڑا سا پیکٹ اُٹھایا۔"چوکلٹس — جو تم نہیں کھاتیں..."

"اوہ"۔اُسے اپنی کہی بہت پہلے کی بات یاد آ گئی۔

دریا کنارے زار نے اُسے شروع شروع میں ہی چوکلیٹ آفر کی تھی۔ جسے اُس کے ساتھ دوستی ہو جانے کے ڈر سے اُس نے ریفیوز کیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ وہ چوکلیٹ نہیں کھاتی۔

"تھینک یو۔ مجھے چوکلٹس بہت پسند ہیں"۔اُس نے اُس سے پیکٹ تھام لیا۔

"Yea, I knew it."

اور ہیزل اور زار دونوں ہنس دیے۔

وہ کوفی کا کہنے کمرے سے باہر نکل گئی۔اور زار بالکنی میں لگی خوبصورت کوفی ٹیبل کی کرسی پر آ بیٹھا۔

یہاں بھی سبزہ ہی سبزہ تھا۔قد آور درخت تھے۔ ہیزل کی آنٹی اچھا ذوق رکھتی تھیں۔

جلدی ہی ہیزل واپس آ گئی۔

"آئیں نیچے چلتے ہیں۔وہیں بیٹھ کر کوفی پئیں گے"۔

وہ خاموشی سے اُس کے ساتھ ہو لیا۔وہ اُسے پچھلی طرف اُسی جگہ لے آئی جسے وہ اوپر سے دیکھ دیکھ کر سراہ رہا تھا۔

اُسے وہیں بٹھا لیا۔

"مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے۔ پتہ نہیں آپ کو اچھا لگ رہا ہے یا نہیں"۔ ہیزل بولی۔

"مجھے بھی اچھا لگ رہا ہے۔میں اوپر بالکنی سے یہی سب کچھ دیکھ رہا تھا"۔

"پھر ٹھیک ہے۔ہم یہیں بیٹھیں گے"۔

"جیسا حکم سرکار"

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

وہ اُس کے ڈمپل کو تکتا رہا۔

"ایسا کیا دیکھ رہے ہیں"۔

"آنکھیں میری اپنی ہیں جیسے بھی دیکھوں"۔

وہ دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ ملازم کوفی لئے آ گیا۔نزدیک ہی رکھی میز اٹھا کر اُن کے آگے رکھی۔اور کوفی لگا کر چلا گیا۔

زار نے ہیزل کے لئے کوفی بنائی۔ اُس کے آگے رکھی۔ پھر اپنے لئے بنائی۔اور گھونٹ گھونٹ کر کے مزیدار بلیک کوفی حلق سے اتارنے لگا۔

باتیں کرتے کرتے موضوع کامران پر آ ٹکا۔

"تمہیں اپنے نوکروں پر بہت اعتماد تھا۔لیکن پتہ نہیں کیوں میرا دل کہتا تھا۔ تمہارے نوکروں میں سے کوئی نہ کوئی اُس کے لئے مخبری کرتا ہوگا..."زار نے کہا۔

"اور میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ کہ اِن نوکروں میں سے کوئی ایسا بھی کر سکتا ہے"۔

"اب آئندہ خیال رکھنا پلیز۔ ویسے پتہ چلا کہ اِن میں سے کون کامران کا آدمی

تھا؟''

''اشرف بابا کو ایک گارڈ پر شک ہے۔لیکن میں اُس گارڈ کو نکال نہیں سکتی۔خاص کر اِن دنوں میں۔کہ کامران کی نظریں مجھ پر لگی ہیں۔ مجھے یہ بھی خدشہ ہے کہ یہ بات اُس نے ڈیڈ کو بھی بتائی ہوگی۔اب مجھے اپنے چاروں طرف جال بچھے نظر آتے ہیں۔خود کو اچانک بہت کمزور محسوس کرنے لگی ہوں...''اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

زار نے اپنا خالی کپ میز پر رکھا۔انگلیوں سے اُس کے ڈھلکتے آنسو خشک کیے۔۔

''کمزور نہیں۔لیکن محتاط ضرور رہنا چاہیے۔خاص کر جب اتنے بڑے مجرم آس پاس منڈلا رہے ہوں''۔

ہیزل کچھ نہیں بولی۔خاموشی سے میز قدرے پرے ہٹا دی۔

زار تھکا ہوا تھا۔کوٹ اتارتے ہوئے بنچ پر رکھا۔اور خود دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھتے ہوئے گھاس پر لیٹ گیا۔

ہیزل بھی اُس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔سر آہستگی سے اُس کے چوڑے سینے پر رکھ دیا۔

زار دھیرے دھیرے اُس کے بال انگلیوں سے سہلانے لگا۔

''تمہیں پتہ ہے جس جگہ کامران نے مجھے تہہ خانے میں رکھا تھا وہاں کا چوکیدار کیا کہہ رہا تھا؟''

''کیا کہہ رہا تھا؟''وہ سر اٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔

''کہہ رہا تھا۔یہاں کا مالک اِسی طرح کسی نہ کسی کو اِس تہہ خانے میں لا کر لاک کر دیتا ہے۔اور پھر اُسے اپنے آدمیوں سے پٹوا پٹوا کر مروا کر ریل کی پٹڑی پر ڈال آتا ہے...''

ہیزل کی آنکھوں میں کرب کے ساتھ خوف بھی اتر آیا۔

''اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو؟''

''نہیں ہوا نا۔دیکھو۔ٹھیک ٹھاک تمہارے سامنے ہوں۔''

''بہت مارا اُس نے آپ کو؟''

''اُس نے نہیں۔اُس کے پالتو غنڈوں نے مارا تھا''۔

''کتنے لوگ تھے؟''

''چار''۔

ایک بار پھر ہیزل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کہاں مارا تھا؟''

''یہاں''۔اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

ہیزل نے وہیں اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

''اور کہاں مارا تھا؟''

''ہاتھوں پر''۔

اُس نے باری باری اُس کے دونوں ہاتھوں پر پیار کیا۔

''اور؟''

''یہاں''۔اُس نے اپنے ماتھے کی طرف اشارہ کیا۔

ہیزل نے وہاں بھی اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

''اور؟''

زار کی دلنشیں آنکھیں اچانک شرارت سے چمک اٹھیں۔

''یہاں''۔اُس نے انگلی اپنے پُرکشش ہونٹوں پر رکھ دی۔

ہیزل اپنی رو میں آگے بڑھی ہی تھی۔ کہ ہوش آ گیا۔ وہیں رک گئی۔

''آپ بہت خراب ہیں''۔

وہ زور سے ہنس دیا۔

''خواہ مخواہ خراب ہوں۔ اُنہوں نے میرے جسم کا کوئی بھی حصہ بغیر hit کئے نہیں چھوڑا تھا۔ میں سخت جان تھا کہ مرا نہیں۔ ورنہ انہوں نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی...''

ہیزل کتنی بے بس تھی۔ ایک بار پھر اُس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے رو دی۔

زار نے اُسے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھر لیا۔ ڈھیر سارا پیار کیا۔

''ہر رات کے بعد دن آتا ہے۔ اندھیرے کے بعد روشنی ضرور ہوتی ہے۔ ہماری بھی صبح ہو گی انشاءاللہ''۔

''آپ مجھے یہاں سے لے جائیں۔ کہیں دور لے جائیں''۔

''میں تو ابھی لے چلوں۔ لیکن ---نادر کا کیا ہو گا؟''

''یہی تو ساری مشکل ہے۔ ویسے... ڈیڈ اور نادر پاکستان آ رہے ہیں''۔

کامران نکاح میں ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔ تو ذوالفقار شاہ نے خود ہی پاکستان آنے کی ٹھان لی تھی۔

''اچھا''؟

''آپ کو پتہ ہے ڈیڈ کیوں آ رہے ہیں؟''

''کیوں آ رہے ہیں؟''

''میرے اور کامران کے نکاح کے سلسلے میں''۔

''کیا؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ہاں سر''۔

''تم نے مجھے پہلے نہیں بتایا''۔

''مجھے بھی صرف کل ہی کامران نے فون پر بتایا ہے۔ آپ آ ہی رہے تھے تو میں نے سوچا ملنے پر بتا دوں گی... کون سی اتنی اچھی خبر ہے...''

''کب آ رہے ہیں تمہارے ڈیڈ؟''

''دو ہفتے بعد''۔

''اور نکاح کا کب ارادہ ہے؟''

''دو ہفتے کے لئے آ رہے ہیں۔ ظاہر ہے انہی دنوں میں پروگرام بنائیں گے''۔

''نہیں ---ایسا نہیں ہو گا۔ بالکل بھی نہیں ہو گا''۔

''میں اُن ہی کے رحم و کرم پر ہوں۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں''۔

''نہیں۔ وہ تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے''۔

''دوسری صورت میں نادر...''

''نو۔'' اُس نے اُس کی بات کاٹی۔ ''اتنا اندھیر بھی نہیں ہے۔ تم اللہ پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہیں اور نادر کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ نہ تمہارا نکاح کامران سے ہو گا اور نہ ہی نادر تک اُن کے ہاتھ پہنچیں گے''۔

اُس کی باتوں سے اُسے بہت ڈھارس ملی۔ اس کے باوجود وہ یہ سوچنے پر مجبور تھی۔ کہ وہ یہ سب کرے گا کیسے؟ بہر حال---

''تمہاری آنٹی کس وقت آئیں گی؟'' اُس نے باتوں کا رخ بدلنا چاہا۔

''اُن کا فون آیا تھا کہ وہ رات کو ہی لوٹیں گی۔ کہتی تھیں یہ سارا وقت انہوں نے ہم دونوں کو دے دیا ہے''۔

"واؤ— کتنی نائیس ہیں تمہاری آنٹی"۔

"آپ ملیں تو آپ کو پتہ چلے۔ واقعی بہت اچھی ہیں"۔

وہ دوبارہ گھاس پر لیٹ گیا۔ ساتھ ہی اُس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

سردی یہاں بھی خاصی تھی۔ نرم و گرم سنہری دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔

"دل چاہتا ہے ساری زندگی بس ایسے ہی گزر جائے"۔ اُس کے چوڑے سینے پر سر رکھے، اُس کے دل کی دھڑکنیں محسوس کرتی ہیزل دھیرے سے بولی۔

زار نے کچھ کہے بنا اُسے اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ بے تحاشا پیار کرنے لگا۔

"ہیزل"۔

"جی"۔

"کتنا چاہتی ہو مجھے؟" وہ اچانک بولا۔

"اتنا زیادہ کہ میں خود اندازہ نہیں کر سکتی"۔

"I'm so lucky. کہ مجھے تم جیسی لڑکی کا پیار ملا ہے ..."

"جو ہر طرف سے خطروں میں گھری ہے۔ اور جس کو جو بھی ہاتھ لگائے۔ وہ بھی خطروں میں گھر جائے..."

"جو بھی نہیں۔ صرف زار۔ اور پھر میں خطروں سے تو ڈرتا نہیں۔ ایسا ہوتا تو صحافی نہ بنتا"۔

سر اٹھاتے ہوئے وہ اُسے چند پل اپنائیت سے تکتی رہی۔ پھر دوبارہ سر اُس کے سینے پر رکھ دیا۔

"ویسے اِس طرف کوئی آتا جاتا نہیں؟ ہم اتنے آرام سے بیٹھے ہیں"۔

"کوشش کی بھی ہوگی آنے کی۔ تو واپس چلا گیا ہوگا ہمیں اِس پوز میں دیکھ کر"۔

"ویسے اچھی بات نہیں ہے"۔

"آپ بے فکر رہیں۔ میں نے منع کر دیا ہے اُنہیں اِس طرف آنے سے"۔

"اِس کا مطلب ہے یہاں بھی تمہارا اُتنا ہی رعب ہے جتنا اپنے اسٹیٹ میں"۔

وہ بے اختیار ہنس دی۔

"میں کب رعب ڈالتی ہوں۔ خود ہی مرعوب ہوں تو اِس میں میرا کیا قصور ہے"۔

"ایک میں ہی تم سے نہیں ڈرتا ورنہ..."

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"کیا پتہ آپ بھی ڈرتے ہوں"۔

"نہیں— میں نہیں ڈرتا۔ تم مجھ سے ڈرتی ہو تو الگ بات ہے"۔

"میں نہیں ڈرتی"۔

"کامران سے ڈرتی ہو؟" وہ اچانک بولا۔

"وہ بہت کمینہ انسان ہے۔ اُس سے تو ہر لڑکی ڈرتی ہوگی"۔

"اور میری نیت بدل گئی تو؟" وہ اب بھی اُسے سینے سے جکڑے تھا۔

"مجھے پتہ ہے ایسا نہیں ہوگا"۔

"پھر بھی"۔

"تو میں آپ کو اتنا ماروں گی اتنا ماروں گی..."

"تم؟ مجھے مارو گی؟" اُس کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

"ہاں"۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُسے اب بھی اپنے سے لپٹائے ہوئے تھا۔

''چلو۔ مار کر دیکھو''۔ اُس نے اُسے اور بھی سختی سے جکڑ لیا۔

''آپ مجھے چھوڑیں تو ماروں نا''۔

''اب پتہ چلا۔ کہ نہیں مار سکتیں۔ میں اِسی طرح لپٹائے رکھوں گا تو کیسے مارو گی؟''۔ اُس نے اپنی گرفت مزید سخت کر دی۔

''پلیز! دم گھٹنے لگا ہے میرا''۔ اُس نے احتجاج کیا۔

''پھر رعب ڈالو گی؟''

''نہیں''۔ واقعی اُس کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔

اور — زار نے اُسے چھوڑ دیا۔

ہیزل نے گہری لمبی سانس لی۔

''اوہ... مجھے واقعی suffocation ہونے لگی تھی''۔

''رعب ڈالنے کی کوشش کرو گی تو ایسا ہی ہو گا''۔

''اچھا بابا''۔ ہیزل نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''آئندہ رعب نہیں ڈالوں گی''۔

اور — زار نے اُس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے باری باری اُن پر پیار کر لیا۔

وہ شام ڈھلنے تک اُس کے پاس رہا۔ دونوں نے بہت ساری پیاری پیاری باتیں کیں۔ ڈھیر سارا پیار کیا ایک دوسرے کو۔

بہت زبردست لنچ کیا۔ شام کی چائے پی۔ اِس دوران آئندہ کے پروگرام بنے۔ اچھے اچھے، سہانے سہانے۔ یہ الگ بات تھی کہ ہر پروگرام مبہم سا تھا، مشروط

سا۔ واضح نہیں تھا بالکل بھی۔ کہ —

بہت سارے Ifs & Buts تھے بیچ میں۔ ذوالفقار شاہ تھا، کامران تھا، نادر تھا!

پھر بھی — زار نے تو کرنا تھا۔ اول تو یہ — کہ یہ اُس کی ڈیوٹی تھی۔ دوسرا یہ کہ — ہیزل کو ہر صورت اِن خونخوار درندوں کے چنگل سے آزاد کرانا تھا!

''مجھے اپنا روم نمبر بتائیں۔ میں آؤں گی آپ کے پاس''۔

''میرا روم نمبر سیون ہے۔ نام 'علی' لکھا ہے۔ یاد رکھنا۔ اور پلیز تم مت آنا۔ میں خود آ جاؤں گا۔ ویسے بھی پرسوں بہت سویرے نکلوں گا گھر کے لئے...''

''کیا مطلب؟ صرف دو دن کے لئے آئے ہیں آپ؟''

''یقین کرو یہ دو دن بھی بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے۔ کام ہے آج کل بہت زیادہ''۔

''اچھا کل کتنے بجے آئیں گے؟''

''تم بتاؤ۔ کس وقت آؤں؟''

''صبح صبح۔ بالکل صبح...''

''تم خوابوں میں آئیں۔ تو اتنی صبح نہیں آ سکوں گا۔'' اُس نے حسبِ عادت اُسے چھیڑا۔

''میں خواب میں نہیں آؤں گی۔ آپ صبح آٹھ بجے تک آ جائیں''۔

''تم میرے خوابوں میں نہیں آؤ گی۔ تو میں بھی نہیں آؤں گا تمہارے پاس''۔

''اچھا آؤں گی۔ اب تو آئیں گے نا''۔

''تم خوابوں میں آؤ گی۔ تو خاک آنکھ کھلے گی صبح صبح''۔ وہ باز نہیں آ رہا تھا۔

ہیزل نے خشمگیں نظروں سے اُسے دیکھا۔

''باپ رے۔آ جاؤں گا صبح صبح۔اب خوش؟''

اور — وہ اُس کے انداز پر بے اختیار ہنس دی۔

''اچھا۔اب چلوں۔دیر ہو رہی ہے''۔

''دیر کہاں ہو رہی ہے۔'' ہیزل کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا کہ وہ جائے۔

''اوپر سے تمہاری آنٹی آ گئیں تو سوچیں گی۔کتنا ندیدہ ہے۔ پہلے کبھی پیار ہی نہیں کیا شاید...'' ایک بار پھر وہ اُسے چھیڑ رہا تھا۔

ہیزل ایک بار پھر اُسے گھورنے لگی۔

''اِسکا مطلب ہے پہلے بھی فلرٹ کرتے رہے ہیں''۔

''توبہ توبہ''۔اُس نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔شکل مسکین ہو گئی۔''مجال ہے کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو''۔

ایک بار پھر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔کیا چیز تھا۔اُس کی باتیں واقعی بہت دلچسپ تھیں!

وہ جانے لگا۔تو وہ بھی اُس کے ساتھ پورچ تک آ گئی۔

''بائے''۔زار نے کہا۔اور گاڑی کی طرف بڑھا۔

''بائے''۔ہیزل بولی۔اور —

وہیں کھڑی اُسے جاتے دیکھتی رہی۔گاڑی گیٹ سے باہر نکل گئی۔تو وہ بھی اندر آ گئی۔

نیلگوں آسمان ابر آلود تھا۔درختوں میں سرسراتی ہوا یخ بستہ اور — ٹھنڈ بڑھ رہی تھی۔

صبح کے دس بج رہے تھے جب زار نے ہیزل کی آنٹی کے گیٹ پر کال بیل دبائی۔

آج آنٹی نے ہی اُسے ریسیو کیا۔ڈرائینگ روم میں بٹھایا۔اور باتیں کرنے لگیں۔

وہ بہت نائیس خاتون لگ رہی تھیں۔ بہت کیئرنگ اور محبت کرنے والی۔اُس سے یوں گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔جیسے عرصے کی جان پہچان تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اندر چلی گئیں۔بدلے میں ہیزل آ گئی۔خفا خفا،روٹھی روٹھی سی۔

وہ سمجھ گیا۔وہ اُس کے دیر سے آنے پر اُس سے ناراض تھی۔لیکن وہ بھی کیا کرتا۔

صبح صبح آتا تو آنٹی کیا سمجھتیں۔ کہ اتنا ہی بے تاب تھا۔ جبکہ وہ واقعی بیقرار تھا ہیزل سے ملنے کے لئے۔ پر --- ایسا کر نہیں سکتا تھا!

وہ پُھولا پُھولا منہ لئے اُس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ چپ چاپ، اُس کی طرف دیکھے بغیر ہی۔

''خیریت؟'' وہ اپنی ہنسی پر بمشکل قابو پا رہا تھا۔

وہ خاموش رہی۔ کوئی جواب نہیں دیا۔

''ہیزل میم صاحب''۔ اُس نے پھر کہا۔

وہ اب بھی چپ تھی۔

''اے میم''۔ اُس نے اُس کے چہرے پر بکھر آئے بال انگلی سے پیچھے ہٹائے۔

مگر --- وہ اب بھی کچھ نہیں بولی۔

تبھی --- آنٹی کا ملازم دونوں کے لئے چائے لیکر آ گیا۔ ساتھ میں چیز سینڈوچز، فروٹ کیک اور ڈھیر سا ڈرائے فروٹ۔

زار نے ہیزل کے لئے چائے بنائی۔ اُس کے آگے رکھی۔ اور --- اب اپنے لئے بنانے لگا۔

''میم صاحب۔ بولو نا'' وہ اپنے کپ میں چمچ چلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں بولوں گی''۔

زار مسکرا دیا۔ خوبصورتی سے۔

''اچھا چائے تو پیو''۔

''نہیں پیوں گی''۔

''ٹھنڈی ہو جائے گی''۔ اُس نے اپنا کپ منہ سے لگا لیا۔

''ہو جائے''۔

زار نے اپنا کپ میز پر رکھا۔ اُس کا اٹھایا۔ اور اُس کے منہ تک لے گیا۔ مجبوراً اُسے گھونٹ لینا پڑا۔

''That's like a good girl.'' وہ بولا۔

''میں اب بھی بات نہیں کروں گی آپ سے''۔ وہ روٹھی روٹھی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اچھا میری بات تو سنو گی نا''۔

''نہیں''۔

زار نے گہری سانس لی۔

پھر --- ہیزل کے کچھ کہنے سننے سے پہلے ہی اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ وہ احتجاج کرتی رہی۔ اور وہ اُسے پیار کرتا رہا۔ اتنا --- کہ اُس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اندازِ خود سپردگی لئے اُس کے مضبوط بازوؤں میں گھری رہی۔ اُس کے مخصوص مدھر پرفیوم کی اروما اُسے مدہوش کئے دے رہی تھی۔ اُس کی گرم مہکتی سانسیں اُسے خود سے بیگانہ کر رہی تھیں۔ اُس کے مقناطیسی جسم کا لمس اُسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر رہا تھا۔

تبھی --- کوریڈور میں کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ اور --- دونوں ہی ہوش کی دنیا میں آ گئے۔

زار اپنی ٹھنڈی چائے کے گھونٹ لینے لگا۔ اور ہیزل نے سینڈوچ اٹھا لیا۔

''میں صبح صبح اِس لئے نہیں آیا۔ کہ تمہاری آنٹی سوچیں گی کہ یہ تو بالکل ہی پاگل ہے...'' زار نے کہا۔

''لیکن یہ بھی تو سوچا ہوتا۔ کہ صرف آج کا دن ہے۔ پھر آپ واپس چلے جائیں

گے‘‘۔

’’واپس جانے کا یہ تو مطلب نہیں۔ کہ پھر آؤں گا ہی نہیں‘‘۔

’’پھر کب آئیں گے؟‘‘

’’جلدی آؤں گا‘‘۔

’’اور وہ... کامران...‘‘

’’تسلی رکھو۔ تمہارا نکاح اُس سے نہیں ہونے دوں گا‘‘۔

’’مجھے ہر وقت فکر لگی رہتی ہے‘‘۔

’’فکر کی بجائے اللہ کو یاد کرو۔ وہی کرنے والا ہے سب کچھ۔ ویسے — کامران یہاں آتا ہے۔ تمہاری آنٹی کے گھر؟‘‘

’’نہیں‘‘۔

’’تمہارے ڈیڈ؟‘‘

’’وہ بھی کبھی نہیں آئے۔ دونوں کو صرف ہمارے اسٹیٹ اور اُس میں اپنی سمگلنگ کو ترقی دینے کی فکر ہے۔ اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں‘‘۔

زار کو دکھ سا ہوا۔ کتنے مطلب پرست لوگ تھے!

اُس نے گہری سانس لی۔ پھر ماحول کو خوشگوار بنانے کی خاطر مسکرایا۔

’’ویسے تمہاری آنٹی اچھی لگتی ہیں۔ اچھا ہے کوئی تو ہے۔ جو بغیر کسی مطلب کے تم سے ناطہ رکھے ہوئے ہے‘‘۔

’’بہت اچھی ہیں آنٹی۔ ہمیشہ میرا خیال رکھا ہے۔ امی کے بہت کلوز تھیں...‘‘

’’اِن کے شوہر یا کوئی اور...‘‘

’’شوہر کبھی کے فوت ہو چکے ہیں۔ ایک بیٹا ہے۔ امیریکہ میں ایم ڈی کر رہا

ہے۔ بس ختم کر کے آنے ہی والا ہے‘‘۔ ہیزل مسکرائی۔ ’’آنٹی کی بہت خواہش تھی کہ مجھے اپنے بیٹے کے لیئے مانگ لیں۔ مگر ڈیڈ کی وجہ سے خاموش رہیں۔ اور پھر پتہ نہیں کیوں اُن کے ذہن میں یہ بھی بات تھی کہ اُن کے بیٹے اور میرے سٹیٹس میں فرق تھا... حالانکہ مجھے اِس بات کا کبھی خیال نہیں آیا‘‘۔

’’یعنی یہاں بھی میرے رقیب ہیں؟‘‘

’’بالکل نہیں ہیں۔ آپ فکر مت کریں‘‘۔

’’اچھا جاؤ شاباش۔ میری چائے گرم کرواؤ۔ ٹھنڈی نہیں پی جائے گی۔‘‘

’’میں دونوں کے لئے دوسری چائے کا کہہ کر آتی ہوں‘‘۔ ہیزل اُٹھ کر چلدی۔

تھوڑی ہی دیر بعد خود ٹرے میں کپس لئے آ گئی۔

’’اتنی دیر لگا دی۔ کسی اور سے کہہ دیتیں‘‘۔ وہ زیادہ سے زیادہ اُسے اپنی نظروں کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔

’’نوکر آ کر ڈسٹرب کرتے ہیں۔ اِس لئے خود لے آئی‘‘۔

’’ہم باتیں ہی تو کرتے ہیں۔ ڈسٹرب کیوں ہونگے‘‘۔ ساتھ ہی اُس نے اپنے پُرکشش ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔

اُس کی آنکھوں میں شوخی تھی۔ لبوں پر شریر مسکراہٹ!

’’یہ آپ باتیں کر رہے ہیں؟‘‘

’’میں تو بس ایسی ہی باتیں کروں گا‘‘۔

’’اِسی لئے تو ٹرے نوکر سے نہیں منگوائی۔ کہیں بھولے سے بھی نظر پڑ گئی۔ تو ہیزل میم صاحب گئی کام سے...‘‘

’’تو — اتنا رعب ہے ہیزل میم صاحب کا؟‘‘

''ہاں۔ ہیزل میم صاحب انسان ہی نہیں ہے۔ بس صرف میم صاحب ہے''۔
اُس کے لہجے میں دور کہیں طنز سا چھپا تھا۔

''مایوس نہیں ہوتے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ''۔

''مگر کب؟''

''جلدی ہی''۔

''جب ڈیڈ آ جائیں گے اور کامران اور قاضی کو لا کر میرا نکاح پڑھوا دیں گے۔ تب ہوگا''۔

''نکاح تو پڑھوا کر دیکھیں''۔

''زار۔ مجھے یہاں سے لے چلیں''۔ اُس نے اپنا سر اُس کے کندھے سے ٹکا دیا۔ ''ایسا نہ ہو کہ ڈیڈ اور کامران اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں اور آپ اور میں دیکھتے رہ جائیں''۔

''میں تمہیں چھپ چھپا کر نہیں لے جاؤں گا۔ سب کے سامنے لے کر جاؤں گا۔ باقاعدہ نکاح کر کے''۔

''لیکن ڈیڈ کے آنے میں بالکل تھوڑے دن ہیں''۔

''تم کیوں مایوسی کی باتیں کرتی ہو۔ مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟''

''اِسی بھروسے کے سہارے ہی تو جی رہی ہوں...''

''تم اچھی اچھی باتیں سوچا کرو...''

''کوئی اچھی بات ہو تو سوچوں''۔

''کیوں نادر نہیں آ رہا؟ یہ کم خوشی کی بات ہے؟''

''نادر کے ساتھ ڈیڈ اور کامران بھی تو آ رہے ہیں۔ وہ اکیلا تھوڑی آ رہا ہے''۔

''شاید اکیلا ہی آ جائے''۔

''ایسا کیسے ممکن ہے؟''

''اللہ تعالیٰ کیا نہیں کر سکتا''۔

ہیزل نے گہری سانس لی۔

''ہاں۔ اللہ تعالیٰ ہی کر سکتا ہے ورنہ ممکن تو نظر نہیں آتا''۔

''وہی تو ہے جو ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے''۔

''ہاں''۔ ہیزل کی خوبصورت آنکھیں بھر آئیں۔

زار نے باری باری اُس کی دونوں آنکھوں کی نمی اپنے ہونٹوں میں اٹھالی۔

''تم میرے پاس ہوتی ہو۔ تو بالکل چھوٹی بچی لگتی ہو۔ دور ہوتی ہو تو اچانک — ہیزل میم صاحب بن جاتی ہو''۔ وہ خوشگواری سے بولا۔

''آپ بھی... جب میرے سامنے ہوتے ہیں تو جیسے کوئی affectionate گریک گوڈ ہو۔ اور جب دور چلے جاتے ہیں تو ایک daring journalist لگتے ہیں جو خطرناک ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتا ...''

''Wow—thank you for the compliment.'' ایک بار پھر اُس نے اُسے پیار کیا۔

''اب آپ اپنی چائے ختم کریں۔ میں تیسری بار نہیں لاؤں گی۔'' ہیزل نے دھمکی دی۔

اور — زار واقعی چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دونوں چائے بھی پیتے رہے۔ دلچسپ باتیں بھی کرتے رہے۔

زار گھڑی گھڑی ہیزل کی خوبصورت آنکھوں میں جھانک جاتا۔ ہیزل اُس کی

بولتی آنکھوں کو سہار نہ پاتی۔ پلکوں کی چلمن گرا لیتی!
زار محضوظ ہو ہو جاتا۔ پرکشش ہونٹوں سے اُسے چھو چھو لیتا!
پھر — دونوں نے ہی چائے ختم کر لی۔ کپس میز پر رکھ دیئے۔
''جاؤ آنٹی سے اجازت لو۔ باہر گھومنے جاتے ہیں''۔

دونوں خوب خوب گھومے پھرے۔ قدیم تاریخی شہر تھا۔ بے شمار یادگار مقامات ماضی کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ جدید ترین بلڈنگز تھیں، قدیم ترین عمارتیں تھیں۔ کہیں نئے شوپنگ مالز تھے، تو کہیں فٹ پاتھ پر سجے سٹالز تھے۔ کہیں فلک بوس شاندار ہوٹلز تھے، تو کہیں لکڑی کے کھوکھوں میں بکتے اشتہا انگیز کھانے تھے۔ کہیں امیروں کی نت نئی کوٹھیاں تھیں، تو کہیں غریبوں کی گھاس پھونس کی جھونپڑیاں تھیں!
زار نے پہلے یہ سب کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُسے ماننا پڑا، لاہور لاہور تھا!
اُنہوں نے لنچ بھی ایک عمدہ ریسٹورانٹ میں کیا۔ شام کی چائے بھی باہر ہی پی۔
جاڑوں کے چھوٹے چھوٹے گلابی دن تھے۔ جلدی ہی سردی سے کانپتا ٹھٹھرتا سورج اپنی پناہ گاہ کی جانب چلدیا۔ کیا عمارات، کیا قد آور درخت اور کیا سیلاب کی سی رواں دواں ٹریفک — سبھی دھوپ کے سیندور میں سیندوری ہو رہے تھے۔
زار ہیزل کے ساتھ گھر تک آیا۔ اُس کی آنٹی سے ملا۔ اور — ہیزل کو 'خدا حافظ' کہتا ہوسٹل کی جانب چلدیا۔

چاند بے چین سا تھا۔ چاندنی بیقرار سی اور — اداس ٹپکاتی رات بے کل سی تھی۔ زار کیا گیا۔ کہ زندگی کی تمام رونقیں بھی ساتھ لے گیا۔ ہیزل اپنے بیڈ روم کی کھڑکی میں اداس سی کھڑی شفاف آسمان پر پورے چاند کو دیکھ رہی تھی۔
معاً سامنے گیٹ پر ہلکا سا ہارن ہوا۔ وہ چونک کر اُس طرف دیکھنے لگی۔
چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ ایک لمبی سیاہ گاڑی اندر داخل ہوئی۔ ہو گا کوئی آنٹی کے ملنے والوں میں سے۔ اُس نے پھر سے نظریں چاند پر جما دیں۔
تھوڑی ہی دیر گزری تھی۔ کہ آنٹی اوپر اُس کے کمرے میں آ گئیں۔
''ہیزل بیٹا۔ تم سے ملنے کامران آیا ہے''۔

اُس کا چہرہ فق ہوگیا۔ کامران سے تو اب اُسے باقاعدہ خوف آنے لگا تھا۔

''کامران؟ یہاں؟'' اُس کی آواز جیسے دور سے آرہی تھی۔

آنٹی کو اُس پر ترس آ گیا۔ وہ کامران سے مل کر آرہی تھیں۔ شکل سے ہی وہ اوباش آوارہ سا لگ رہا تھا۔

''یہاں کیوں آ گیا؟'' وہ جیسے خود سے بولی۔ کہ یہاں تو وہ خود کو ہمیشہ بہت سیکیور محسوس کرتی تھی۔

اور—اچانک اُس کے ذہن میں کوندا سا لپکا— کہیں اُسے زار کا تو پتہ نہیں چل گیا تھا؟

''Kamran is here, be care ful.'' اُس نے فوراً زار کو سیل فون پر میسیج کیا۔

''آؤ بیٹا۔ مل لو اُسے۔ کل کو کوئی مصیبت نہ کھڑی کردے؟''

اُس نے سیل بند کر دیا۔

''مگر آنٹی آپ میرے ساتھ ہی رہیں گی۔ میں اکیلے میں نہیں ملوں گی اُس سے''۔

''اچھا تم آؤ تو سہی''۔

دونوں نیچے ڈرائنگ روم کی طرف چلدیں۔

ہیزل بادلِ نخواستہ اُس سے ملی۔ آنٹی بھی ساتھ تھیں۔ آنٹی محسوس کر رہی تھیں کامران اُن کی موجودگی کو بوجھ سا سمجھ رہا تھا۔ مگر کیا کرتیں۔ ہیزل سے بھی تو مجبور تھیں۔ بیٹھی رہیں اُسی طرح۔

ملازم چائے کے ساتھ سینڈوچز اور ڈرائے فروٹ لایا۔

کامران کے ساتھ اُن دونوں نے بھی چائے پی۔

''آنٹی میں ذرا ہیزل سے اکیلے میں بات کرنا چاہوں گا''۔ کامران نے کہہ ہی دیا۔

آنٹی نہ چاہتے ہوئے بھی ڈرائینگ روم سے چلی گئیں۔

''ہاں—تو کیا حال چال ہیں ہیزل صاحبہ آپ کے''۔ وہ گویا ہوا۔

''ٹھیک ہوں''۔ وہ مختصراً بولی۔

''کچھ چپ چپ سی ہیں''۔

''نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے''۔ وہ زبردستی چہرے پر خوشگواری لائی۔

''دو ہفتے بعد ڈیڈ آرہے ہیں''۔

اُس کا دل زور سے دھڑکا۔

''کس تاریخ کو؟''

''اگلے مہینے کسی بھی دن''۔

''اوہ۔ نادر بھی ساتھ آرہا ہے نا''۔

''ہاں۔''

نادر چار سال بعد آرہا تھا۔ عجیب خوشی تھی کہ غموں کا انبار لیکر آرہی تھی!

''نادر کے آنے کی تو آپ کو بہت خوشی ہوگی۔ میرا خیال ہے کوئی چار سال بعد آرہا ہے''۔ کامران ہی بولا۔

''ہاں۔ ظاہر ہے''۔ ہیزل آہستہ سے بولی۔

''اور ہمارے نکاح کی؟ اُس کی خوشی نہیں ہو رہی؟ ڈیڈ اِسی لئے تو آرہے ہیں''۔

وہ چپ رہی۔ کہتی بھی کیا؟

"ڈیڈ کہہ رہے تھے۔ بہت دھوم دھام سے شادی کریں گے ہماری۔ پہلے ہفتے میں صرف نکاح ہوگا۔ دوسرے ہفتے میں رخصتی ہوگی..."

وہ خاموشی سے سب سن رہی تھی۔ چپ چاپ جیسے اپنی موت کا فیصلہ ہوتے دیکھ رہی تھی۔

زار نے بہت تسلی دی تھی۔ اُسے بھی ڈھارس ملی تھی۔ مگر — اِس وقت پھر — سب ڈانواں ڈول ہوتا نظر آنے لگا۔ زار کو اندازہ نہیں تھا۔ کہ یہ لوگ کتنے خطرناک تھے اور کس حد تک جا سکتے تھے۔ گروہ کے گروہ تھے اِن کے۔ خوفناک شکلیں تھیں۔ پورا مافیا تھا!

اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ سر گھومتا ہوا صوفے کی پشت سے جا لگا۔

"ہیزل کیا ہوا آپ کو؟ کیا بات ہے؟" کامران اٹھتے ہوئے اُسکے پاس آ گیا۔

اُسکی آنکھیں بند تھیں۔ سخت کمزوری چھا گئی تھی اُس پر۔

"ہیزل"۔ اُس نے پھر پکارا۔

ہیزل نے بند آنکھیں کھول دیں۔ خاموشی سے اُس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے ہیزل؟" اُس نے اُس کا چہرہ تھپتھپایا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

وہ سیدھی ہو کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"بخار تھا کچھ دن سے۔ اُسی سے شاید ویکنس ہو گئی ہے"۔ اُس نے بات بنائی۔

"اوہ۔ میں تو گھبرا گیا تھا"۔

"نہیں گھبرانے کی بات نہیں ہے"۔ وہ آہستہ آہستہ سنبھل رہی تھی۔ "بخار ہو جائے تو مجھے کئی دن کمزوری رہتی ہے۔" اُس نے کہا۔

"دوائی ٹھیک سے لے رہی ہیں؟" وہ واپس اپنی سیٹ پر بیٹھا۔

"ہاں"۔

"اپنا خیال رکھیں"۔ وہ مسکرایا۔ "چند دنوں تک ہماری شادی ہونے والی ہے۔ خاصا ہنگامہ ہوگا..."

وہ پھر چپ رہی۔ کہ یہ موضوع ہی اُسے مارے دے رہا تھا۔

"اچھا اب میں چلوں گا"۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "کل صبح صبح واپس جاؤں گا۔ آپ سے ملاقات نہ ہو سکے گی"۔

وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے اُس نے اُسے بوسہ دیا۔ "گڈ نائیٹ"۔ وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ اور دروازے کی طرف بڑھا۔

وہ بھی اُس کے ساتھ پورچ تک آئی۔ کہ یہ تو اُس کی مجبوری تھی۔

وہ چلا گیا۔ ہیزل اندر آ گئی۔ وہیں کوریڈور میں آنٹی ناجیہ کھڑی تھیں۔ ان کے گلے لگ کر وہ بے اختیار رو دی۔ بے حساب رو دی۔

وہ اُسے اپنے کمرے میں لے آئیں۔ اُس کے آنسو پونچھے۔ بہت تسلیاں دیں۔

گرچہ — خود اُن کو بھی اپنی تسلیاں بے معنی لگ رہی تھیں!

قدسیہ نے کتنا بڑا دھوکہ کھایا تھا۔ ذوالفقار شاہ سے شادی کر کے اُس نے خود تو خود اپنی اولاد کو بھی ساری زندگی کے لئے جہنم کی آگ میں دھکیل دیا تھا۔ اور جہنم بھی ایسی کہ بغیر کسی گناہ کے اُس کے دونوں بچے اُس کی لپٹوں میں جھلس رہے تھے۔ کوئی واپسی کا راستہ نہ تھا۔ چاہتے ہوئے بھی کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا اُن دونوں کے لئے۔

یہ کیسی سزا ملی تھی اِن معصوموں کو؟ کس قصور کی سزا بھگت رہے تھے یہ؟

یہ کیسی سزا ملی تھی ان معصوموں کو؟ کس قصور کی سزا بھگت رہے تھے یہ؟

ناجیہ کی آنکھیں خود بخود اوپر اٹھ گئیں۔

''تُو ہی ہے یارب ان کا۔ تُو ہی ان کو اس عذاب سے نکال سکتا ہے بس''۔

انہوں نے گہری دکھی سانس لی۔ اپنی نم آنکھیں پونچھ لیں۔

''بس بیٹا۔ اور نہیں رونا۔ خود کو ہلکان مت کرو۔ دیکھو کیا چھوٹا سا منہ نکل آیا ہے۔ بس کرو۔ خدا سے مدد مانگو''۔

اور --- وہ واقعی چپ ہوگئی۔

آنٹی نے زبردستی اُسے کھانے کی میز پر بٹھایا۔ اُن ہی کی خاطر اُس نے دو نوالے بمشکل حلق سے اتارے۔ آنٹی کھانا کھا چکیں۔ تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

آج اُس نے آنٹی کے ساتھ دیر تک معمول کی گپ شپ بھی نہیں کی۔ بس اوپر گئی۔ کپڑے تبدیل کیے۔ اور بستر میں گھس گئی۔

آنٹی، نوکر چاکر سب جب اپنے اپنے بستروں پر چلے جاتے۔ تو وہ رات کے سناٹوں میں زار کے ساتھ فون پر پہروں باتیں کرتی۔ اِس وقت بھی اپنے سیل پر اُس کا نمبر ملایا۔ پاوَرڈ آف ملا۔ پھر ملایا۔ اور --- پھر ملایا۔ مگر وہی --- آگے سے کوئی رسپانس نہیں تھا!

عجیب بات تھی۔ وہ تو اس وقت اُس کی کال کا بے چینی سے انتظار کرتا رہتا تھا۔ آج کیا ہوگیا تھا؟

مایوس ہو کر اُس نے اپنا سیل بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ اور تھوڑی دیر بعد پھر سے ٹرائے کرنے کا سوچتے ہوئے لحاف اچھی طرح لیکر آنکھیں موند لیں۔

وہ خود بھی تو اُسے کال کر سکتا تھا۔ مگر فوراً ہی اُس نے اپنی سوچ کی تردید کی۔ کہ موقعہ محل دیکھ کر اُسے فون کیا کرے گی۔ بہر حال ---

آدھے گھنٹے بعد اُس نے پھر سے کوشش کی۔ مگر وہی پاوَرڈ آف ملا!

اُداسیوں اور مشکلوں میں گھری صبح کے قریب جا کر کہیں اُس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح کچھ چپ چپ سی تھی۔ دھوپ سہمی سہمی سی اور ــــ دن گھٹا گھٹا سا۔

ناجیہ ناشتے کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر نیوز ضرور دیکھتی تھیں ۔ اِس وقت بھی حسبِ معمول لاؤنج میں بیٹھیں ناشتہ کرتے کرتے ٹی وی پر نظریں جمائے تھیں۔

"کسی نا معلوم شخص نے ہوٹیل کے کمرہ نمبر سات میں مقیم علی نامی آدمی کو قتل کر دیا۔" ایک نیوز سٹرِپ آ رہی تھی۔

ناجیہ سُن کی سُن رہ گئیں۔ ہوٹیل کا نام، کمرہ نمبر اور علی!

یہ تو زار ہی تھا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی!

مگر ـــ کس نے قتل کیا ہوگا؟ کہیں کامران..."

اُن کا سر چکرانے لگا۔ اِس سے پہلے کامران کبھی اُن کے گھر ہیزل سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اُسی نے کیا تھا یقیناً۔ پہلے بھی تو اُسے کڈنیپ کروا کر اپنے غنڈوں سے پٹوایا تھا۔ وہ تو تب ہی اُسے مار دینا چاہتا تھا۔ یہ الگ بات تھی۔ کہ اُس کی زندگی تھی۔ اور وہ بچ نکلا تھا۔

اب کیا ہوگا؟ ہیزل کو کون سنبھالے گا؟ وہ تو اُس کی محبت میں بہت آگے نکل گئی تھی۔

انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ زار سے وہ مِل بھی چکی تھیں۔ بہت اچھا لڑکا تھا۔ اُس کی جوان موت پر اُن کی بھی آنکھیں بھر آئیں۔

دس بجے ہیزل کی آنکھ کھلی۔ پہلا خیال زار کا آیا۔ فون کیا آف تھا!

کیا ہو گیا تھا اُسے؟ وہ جھنجھلائی سی واش روم میں چلی گئی۔

ہاتھ منہ دھوئے، کپڑے تبدیل کئے۔ اور بالوں میں برش کر کے نیچے آ گئی۔

آنٹی پچھلی طرف گھاس پر سنہری دھوپ میں کرسیاں ڈلوائے بیٹھیں کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھیں۔

ہیزل کچن میں ناشتے کا کہتے ہوئے اُن ہی کے پاس آ بیٹھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟" آنٹی کتاب بند کر کے گود میں رکھتے ہوئے بولیں۔

"ٹھیک ہوں آنٹی"۔

"پتہ ہے بلی نے بچے دیئے ہیں۔" ہیزل کو زار کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اِس کے باوجود آنٹی جیسے اُسکا دھیان بٹانے کی خاطر بولیں۔

آنٹی اور ہیزل دونوں ہی بلی کے بچوں کی پیدائش کی منتظر بیٹھی تھیں۔

آنٹی اور ہیزل دونوں ہی بلی کے بچوں کی پیدائش کی منتظر بیٹھی تھیں۔

''اچھا۔ کہاں ہے؟''

''پینٹری کی الماری پر قبضہ کئے بیٹھی ہے۔ بچے بھی ساتھ ہیں''۔

''کتنے ہیں؟''

''تین اور بہت پیارے پیارے''۔

''آنٹی ایک میں لیکر جاؤں گی''۔

''لیجاؤ۔ جو اچھا لگے وہ لیجاؤ''۔

''So nice of you auntie.'' آپ کیسے میری ہر بات مان لیتی ہیں''۔

''کیوں نہ مانوں۔ میری جان ہو تم۔ قدسیہ کی نشانی ہو''۔

''میں اکثر سوچتی ہوں۔ کاش امی ذوالفقار شاہ کی باتوں میں نہ آتیں۔ آج مجھے اور نادر کو یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتے...''

''دھوکہ کھا گئی بچاری۔ خود تو چل بسی۔ عذاب تم دونوں کے گلے پڑ گیا''۔

''دل چاہتا ہے۔ کہیں بھاگ جاؤں۔ ایسی جگہ جہاں اِن کی شکلیں نہ دیکھنی پڑیں۔ جہاں اِن کا ذکر تک نہ ہو۔ پھر فوراً خیال آتا ہے اگر میں نے ایسا کیا تو یہ لوگ نادر کا کیا حشر کریں گے۔ سوچ کر ہی پاگل ہونے لگتی ہوں...''

ناجیہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ زار کا خیال آیا۔

''بیٹا۔ بھاگ کر جاؤ گی بھی تو کہاں؟''

''زار کے پاس۔ اُس کی والدہ اور نانی کے پاس...''

ناجیہ کانپ سی گئیں۔ اگر صبح والی نیوز سٹرپ ہیزل نے پڑھ لی تو؟ کیا ردِعمل ہوگا

آیا تھا۔ تو پہلی بار اُنہوں نے ہیزل کو ہنستے مسکراتے دیکھا تھا۔ پہلی بار اُسکے چہرے پر طمانیت اور خوشی کی دمک دیکھی تھی۔

وہ سوچ ہی رہی تھیں۔ کہ ہیزل کا ناشتہ آ گیا۔

ہیزل ناشتہ کر رہی تھی۔ ساتھ میں غیر ارادی طور پر سیل فون پر بھی نظر جا پڑتی۔ کہ شاید زار کا کوئی میسج ہو۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

ناشتہ کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آنٹی میں بھی اوپر سے اپنا ناول لیکر آتی ہوں۔ اور پھر چلیں گے بلی کی طرف...'' وہ اندر کی طرف بڑھتے بڑھتے بولی۔

لاؤنج میں سے گزرنے لگی۔ تو دیکھا۔ ٹی وی آن تھا۔ اور ملازمہ صفائی کرتے کرتے ٹی وی پر بھی نظریں رکھے تھی۔ شاید اُسی نے آن کیا تھا۔ پل بھر کو وہ بھی رک گئی۔ نیوز آ رہی تھیں۔ نیچے نیوز سٹرپ پر نظریں گئیں۔ اور پھر—

وہ وہیں قالین پر گر گئی۔ کوئی ہوش نہیں رہا۔

ملازمہ گھبرا کر جلدی سے ناجیہ کو بلا لائی۔

ناجیہ اندر آئیں۔ ہیزل کو قالین پر بے سدھ پڑے دیکھا۔ تو گھبرا گئیں۔

''ہیزل... ہیزل بیٹا'' وہ اُس کا چہرہ تھپتھپا رہی تھیں۔ ''ہیزل کیا ہوا؟...''

''بھاگ کر جاؤ۔ گلاس میں پانی لاؤ''۔ اُنہوں نے ملازمہ سے کہا۔

وہ دوڑ کر پانی لے آئی۔

ناجیہ ہیزل کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دینے لگیں۔ واقعی ہیزل نے آنکھیں کھول دیں۔

''کیا ہوا میرا بچہ؟'' اُنہوں نے اُسے سہارا دے کر بٹھایا۔ خود ساتھ بیٹھ کر اُس کا

سر اپنی گود میں رکھا۔

''وہ مر گیا آنٹی''۔ وہ وحشت بھری آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

اوہ — تو اُس نے بھی زار کے بارے میں نیوز دیکھ لی تھیں!

''تم جاؤ''۔ انہوں نے ملازمہ سے کہا۔

اور وہ باہر چلی گئی۔

''اٹھو میری جان۔ صوفے پر آؤ''۔ انہوں نے اُسے اٹھنے میں مدد دی۔ صوفے پر لے آئیں۔

اُس کے سر کے نیچے کشن دیئے۔ خود بھی پہلو میں بیٹھ گئیں۔ کچھ سمجھ نہ آتی تھی۔ کہ کیا کہیں؟

''آنٹی وہ مر گیا ہے''۔ اُس نے پھر دہرایا۔ پھیلی پھیلی آنکھیں اب بھی آنٹی پر لگی تھیں۔

''وہ مر گیا''۔ اب کے اُس کی آنکھیں خالی خالی سی تھیں۔

ناجیہ جلدی سے گئیں۔ اُس کے لئے گلوکوز بنا کر لائیں۔ کوشش کر کے آدھا گلاس پلایا۔ پھر گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے شفقت سے اُس کے بال سہلانے لگیں۔

''حوصلہ کرو بیٹا''۔ انہوں نے کہا۔

''وہ مر گیا''۔ جواب میں وہ اتنا ہی بولی۔ خالی خالی آنکھیں اب بھی اُن پر جمی تھیں۔

ناجیہ گھبرا سی گئیں۔ اُن کی کسی بات کا وہ مطلب نہیں لے پا رہی تھی۔

''وہ مر گیا''۔ وہ ایک بار پھر بولی۔ اور —

ناجیہ اُسے ملازمہ کی مدد سے باہر پورچ تک لے آئیں۔ گاڑی میں بٹھایا۔ اور

ڈرائیو کرتیں ہوسپٹل لے گئیں۔

ڈاکٹر نے ایڈمٹ کروایا۔ اور اپنی سی کوشش کرنے لگے۔

اُس کو شدید ذہنی صدمہ پہنچا تھا۔ وہ وہاں بھی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ''وہ مر گیا'' دہراتی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے دوائی نے اثر دکھایا۔ اور — وہ غافل ہو گئی۔

''کوئی فکر کی بات نہیں۔ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' انہوں نے ناجیہ کو تسلی دی۔ ''ویسے کون تھا یہ اِن کا؟''

''منگیتر تھا''۔ ناجیہ بولیں۔ کہ اور کیا کہتیں؟

''اوہ — ظاہر ہے shock تو بہت بڑا ہے''۔ ڈاکٹر بولے۔ ''پر ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ فکر مند نہ ہوں''۔

''تھینکس ڈاکٹر''۔ ناجیہ نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر اور نرس چلے گئے۔ تو ناجیہ سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ یہی سوچ رہی تھیں کہ وہ جاگے گی۔ ہوش میں آئے گی تو وہ — اُس کو کیسے تسلی دیں گی؟

وہ تو زار کو اپنی زندگی سمجھ بیٹھی تھی۔ زندگی اتنی جلدی روٹھ جائے گی۔ یہ تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بہت چاہتی تھی وہ اُسے۔ فون پر پہروں اُس کی باتیں کرتی نہ تھکتی تھی۔ جبکہ ناجیہ کو اُس کی خوشی سے خوف آتا تھا۔ کہ کامران اور ذوالفقار شاہ منہ پھاڑے اُس کی خوشیوں کو نگلنے کے درپے تھے۔ ذوالفقار شاہ کامران کے ساتھ اُس کی شادی کروا کر اُسے ہمیشہ کے لئے ذلت کی عمیق گہرائیوں میں گرانے کے لئے بے تاب تھا۔ اور — کامران نے زار کو قتل کروا کر اُس کی پل بھر کی خوشیوں کو بھی چھین لیا تھا۔

دوپہر کے قریب اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر ناجیہ پر نظر پڑ گئی۔ وہ پاس چلی آئیں۔ اور —

ہیزل اُن سے لپٹ کر بے اختیار رو دی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اچھا تھا وہ رو لیتی۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ ناجیہ بھی رو رہی تھیں۔ زار پر بھی اور — ہیزل کی قسمت پر بھی!

اُسے رات کو بھی ڈاکٹر نے ہوسپٹل میں رکھا۔ انڈر ابزرویشن رکھنا چاہتا تھا اُسے۔

اگلے دن دس بجے اُسے ڈسچارج کر دیا۔ tranquilizers اور طاقت کی دوائیاں دیں۔ ناجیہ کو اُسے اکیلا نہ چھوڑنے کو کہا۔ اور —

دونوں گھر آ گئیں۔

ہیزل نے رو رو کر اپنا حال بُرا کر لیا تھا۔ کوشش کے باوجود زار کو بھول نہیں پا رہی تھی۔ اُس کی باتیں۔ اُس کے وعدے، اُس کی تسلیاں یاد کر کر کے روتی رہتی تھی۔

ناجیہ بہتیری کوشش کر رہی تھیں اُس کا دھیان بٹانے کی فکر کی مگر — وقت ہی اُس کا زخم مندمل کر سکتا تھا اور کوئی چیز نہیں!

ناجیہ اُسے ہر شام باہر گھمانے لے جاتیں۔ ڈنر بھی باہر ہی کرواتیں۔ کبھی زبردستی پکچر دکھانے لے جاتیں۔ ہزار جتن کرتیں اُس کو بہلانے کی۔ مگر — ہیزل کسی طرح بھول ہی نہیں پا رہی تھی زار کو!

یہ تو غم تھا ہی کہ اوپر سے ذوالفقار شاہ کا بھی آنے کا دن قریب آ رہا تھا۔ اُسے ایک ہی حل سمجھ میں آ رہا تھا۔

''آنٹی میں ڈیڈ کے آنے سے پہلے ہی خود کو ختم کر دوں گی۔ زہر کھا لوں گی۔ یا چھت سے لٹک جاؤں گی۔ مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا...''

''خبردار جو ایسا سوچا بھی''۔ آنٹی برہم نظر آنے لگیں۔ پھر —

اُٹھیں۔ اور اپنے بیڈروم کی الماری سے قرآن پاک لے آئیں۔

''لو''۔ اُنہوں نے اُسے کلامِ پاک پکڑایا۔ ''روزانہ پڑھو۔ مگر ترجمے کے ساتھ۔ اِس میں ہر دکھ کا مرہم موجود ہے۔ خود بخود آرام آ جائے گا''۔

اور — ہیزل کلامِ پاک لیکر اوپر اپنے کمرے میں گئی۔

کھولا اور — پڑھنے لگی۔

ہیزل بمعہ اشرف بابا کے گھر لوٹ آئی تھی۔ یہاں بھی وہ روزانہ صبح ناشتے کے
بعد بہت خشوع وخضوع سے قرآنِ پاک پڑھتی۔ دل کو واقعی عجیب سا سکون ملتا۔ ایسا
جو اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

یہ الگ بات تھی کہ گھر کے اندر، گھر کے باہر — وہ جہاں جہاں زار سے ملی تھی۔
وہاں سے گزر رہوتا۔ تو دل میں درد ضرور اٹھتا!

ایک انجانا آدمی تھا۔ لیکن بہت جانا پہچانا تھا جیسے — ایک — مانوس اجنبی تھا!

اُس نے گہری دکھی سانس لی۔ ذوالفقار شاہ کے آنے میں بس چار پانچ ہی دن
تھے۔ اُسے آنٹی نے بہتیرا روکا تھا۔ کہ ذوالفقار شاہ اور کامران کی آمد کے وقت وہ

اکیلی نہ ہو۔ اُن کے ساتھ ہوتی۔ تو قدرے مضبوط محسوس کرتی۔ مگر وہ باوجود اُن کے
اصرار کے گھر چلی آئی۔ کہ اُسے کہیں قرار نہیں تھا۔ نہ وہاں اور — نہ یہاں۔

وہ دن رات طرح طرح کے منصوبے بناتی اور بگاڑتی۔ خیالوں ہی خیالوں میں
ذوالفقار شاہ اور کامران کے چنگل سے خود کو آزاد کرانے کی ترکیبیں سوچتی۔ کامیاب
بھی ہوتی۔ مگر — عین اُسی وقت چھوٹا سا نادر سامنے آ کھڑا ہوتا۔ اور وہ مفلوج ہو کر رہ
جاتی۔

یوں ہی تانوں بانوں میں الجھی انگیٹھی میں جلتی لکڑیوں کی آگ کے قریب
صوفے پر بیٹھی تھی۔ کہ اشرف بابا آ گئے۔

''چھوٹی سرکار! آپ سے ملنے صدف نام کی کوئی خاتون آئی ہیں۔'' انہوں نے
اُسے مطلع کیا۔

اُسے کچھ حیرت بھی ہوئی۔ یہ نام اُس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

''بابا ڈرائینگ روم میں بٹھا دیں۔ چائے کا بھی کہہ دیں۔ میں آتی ہوں''۔

بابا واپس چلے گئے۔ ہیزل ابھی تک نائیٹ سوٹ پر گاؤن لئے تھی۔ اٹھی۔ اپنے
ڈریسنگ روم میں جا کر کپڑے تبدیل کئے اور — ڈرائینگ روم میں چلی آئی۔

چائے پینے کے دوران دونوں باتیں کرتی رہیں۔ ہیزل تو خیر کیا بات کرتی۔
صدف ہی دل کا بوجھ ہلکا کر رہی تھی۔

وہ کامران کی مسٹریس تھی۔ مگر اُس سے محبت بھی کرتی تھی۔

''میں نے اُس کے لئے جان پر کھیل کر اُس کی ہر خواہش پوری کی۔ اُس کے کام
نکلوانے کے لئے اپنی عزت تک قربان کی۔ بدلے میں اُس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔
کہ اگر میں اُس سے پریگنینٹ ہوگئی تو وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔ اب میں اُس کے

بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ مگر وہ کہتا ہے abortion کروالو۔ جب میں نے انکار کیا۔ تو مجھے جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دیدی...''

ہیزل چپ چاپ سنتی رہی۔

''کامران شادی شدہ ہے۔ اُس نے سال بھر قبل اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کی ہے۔ اب باپ زور دے رہا ہے کہ وہ آپ سے بھی شادی کر لے۔ میں اِسی سلسلے میں آئی تھی۔ کہ آپ کو پہلے سے بتا دوں۔ تاکہ آپ سوچ لیں اِس بارے میں۔ باقی... کامران کیا ہے؟ کیا کیا کرتا ہے؟ اِس بارے مَیں میں زبان کھولنے سے مجبور ہوں۔ وہ مجھے چیونٹی کی طرح مسل دے گا''۔

ہیزل تلخی سے مسکرا دی۔ اور بس!

کہ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ احتجاج اور انکار تو کیا۔ گِلہ تک نہیں کر سکتی تھی۔ کہ اُن کے پاس اُس کا بھائی یرغمال تھا۔ اُس کے نادرکی کمزور گردن ذوالفقار شاہ کے آہنی پنجے میں جکڑی تھی۔ ہیزل کی ذرا سی نافرمانی پر وہ اُس کی گردن مروڑ سکتا تھا!

صدف چلی گئی۔ اور ہیزل اپنے بیڈ روم میں آ کر بستر پر اوندھی پڑ رہی۔ روتی گئی۔ اور لمحے بیتتے گئے۔

دوپہر کو ہیزل سو کر اٹھی۔ تو کمرے میں ملگجا اندھیرا ہو رہا تھا۔ گھڑی پر نگاہ گئی۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ اٹھتے ہوئے چوڑی فل لینتھ کھڑکی کے پردے کھولے۔ تیزی سے برف کے فلیکس گر رہے تھے۔ اور ___ وقت سے پہلے ہی شام اُتر آئی تھی۔

اُس نے گہری سی سانس لی۔ انٹرکوم پر اپنی چائے اوپر منگوالی۔

پھر واش روم گئی۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ بال برش کئے اور ___ کھڑکی کے پاس لگی خوبصورت کوئی ٹیبل کی خوبصورت کرسی پر آ بیٹھی۔

باہر تیزی سے برف گر رہی تھی۔ اُس پار کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سب سفید سفید تھا!

سوچوں میں گم چائے پی رہی تھی۔ کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اور کامران اندر آ گیا۔

اُس نے یہ بھی انتظار نہیں کیا تھا۔ کہ ہیزل کی طرف سے اُسے اجازت تو ملتی۔ ہیزل کے دل میں نفرت کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔

کامران اُس کے پیچھے کی طرف آیا۔ اور اُس پر جھکتے ہوئے اُسے بوسہ دیا۔

''Hi darling.'' وہ بولا۔

''Hi.'' ہیزل نے بمشکل کہا۔ اور وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کیسی ہیں آپ؟''

''ٹھیک ہوں''۔ اُس کے ذہن میں اب بھی ہلچل مچی ہوئی تھی۔

''بیٹھنے کو نہیں کہیں گی؟''

''بیٹھیں''۔ اُس نے مختصراً کہا۔

وہ مقابل والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آپ بھی بیٹھیں نا''۔

وہ آہستہ سے دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''کتنی خوبصورت جگہ میں رہتی ہیں آپ''۔ وہ باہر کے نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔

ہیزل کا دل چاہا۔ کہہ دے۔ 'یہ جگہ تم لے لو۔ لیکن مجھے چھوڑ دو۔ میرے بھائی کو آزاد کر دو۔ ہم دونوں کسی جھونپڑی میں رہ لیں گے۔ مگر ہمیں جینے دو۔ اپنی مرضی سے جینے دو...'

مگر نہ کہہ سکی۔ بہت، بہت مجبور تھی!

کامران کے لئے بھی چائے آ گئی۔ ساتھ میں کئی لوازمات تھے۔ کہ وہ اِس گھر کا ہونیوالا داماد جو تھا۔

''میں اِس لئے آیا ہوں۔ کہ آپ کو ساتھ لیکر آپ کی مرضی کی شوپنگ کر لوں...''

''آپ اپنی مرضی سے کر لیں۔ جو آپ کو پسند ہوگا۔ وہ مجھے بھی پسند ہوگا''۔

''Are you sure?'' وہ اُس کے چہرے کو پڑھنے لگا۔ کہ زار کی موت کے بعد اُس کا کیا ردِعمل تھا۔ مگر—

ہیزل کا چہرہ سپاٹ تھا۔ بُرا بھلا کوئی بھی تاثر نہیں تھا وہاں!

''Yes, I am sure.'' وہ کسی بھی جذبے سے عاری آواز میں بولی۔

وہ ہنس دیا۔ اُس کی ہنسی بہت wicked تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ کہ کیا اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ زار میں دلچسپی لیتی تھی۔ اُس کے ساتھ شادی صرف اُس کی مجبوری تھی۔ بہر حال—

''نہیں۔ دونوں چلیں گے۔ مجھے لڑکیوں کی پسند ناپسند کا کوئی خاص تجربہ نہیں ہے''۔

ہیزل کے ہونٹوں پر بھی غیر محسوس سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ جیسے وہ بھی کیا جانتی نہیں تھی۔ کہ وہ کتنی لڑکیوں کو پاؤں تلے روند کر گزرا تھا!

''کب جانا ہے؟'' وہ مصالحت پر اتر آئی۔ کہ —

ظاہر ہے اب تو جو وہ کہتا اُس نے کرنا تھا۔ انکار یا تکرار کس بل بوتے پر کرتی۔ زار ہوتا اِس دنیا میں تو پھر بھی کوئی بات تھی۔ گرچہ تب بھی اُسے اِس قید سے نکلنے کی اُمید کم ہی تھی۔

''آپ کہیں تو ابھی چلتے ہیں''۔

''ابھی کیسے جا سکتے ہیں۔ راستے میں ہی رات ہو جائے گی...''

''کیا فرق پڑتا ہے۔ وہیں کہیں ہوٹیل میں رات گزار لیں گے۔ پھر کل شوپنگ کر کے واپس آ جائیں گے''۔

وہ چند لمحے اُسے حیرت سے تکتی رہی۔

''پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ آپ میری منگیتر بھی ہیں''۔

''منگیتر ہوں۔ منکوحہ نہیں ہوں''۔

''اوہ — تو چلیں پہلے نکاح کر لیتے ہیں۔ پھر چل پڑتے ہیں شوپنگ کے لئے''۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

وہ چپ رہی۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ اُسے اُس کی باتیں، اُس کی ہنسی زہر لگ رہے تھے۔

''اچھا چلیں کل کر لیں گے۔ اب خوش''۔ وہ چائے پیتے پیتے بولا۔

وہ مطمئن سی ہو گئی۔ مگر بولی اب بھی کچھ نہیں۔

''آپ کچھ ... چپ چپ سی ہیں کیا بات ہے؟''۔ وہ بغور اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

جبکہ — دونوں جانتے تھے۔ کہ بات کیا ہے؟

"کوئی خاص نہیں۔ بس سر میں درد ہے..." اُس کے سر میں درد نہیں تھا۔

"تو سر درد کی گولی لے لیں"۔

"لے لی ہے۔" اُس نے مختصراً کہا۔

"ٹھیک ٹھاک رہیں۔ شادی کے بعد سستی نہیں چلے گی"۔

اُس نے جس غرض سے بھی کہا تھا۔ ہیزل کو اچھا نہیں لگا۔

"بس جیسی اب ہوں۔ ویسی ہی بعد میں بھی رہوں گی"۔ اُسے خود بھی اپنا لہجہ بہت blunt اور بیزار سا محسوس ہوا۔

"آپ شاید برا مان گئیں"۔ وہ کھسیانا سا بولا۔

اور — ہیزل نے گہری سانس لی۔ اُسے اُس کی بات کا برا نہیں منانا چاہیے تھا۔ ہر حال میں اُس کی تابع ہونا چاہیے تھا۔

"نہیں۔ میں نے بُرا نہیں منایا"۔

"اچھا۔" کامران نے خالی کپ میز پر رکھا۔ "اِس وقت میں جاتا ہوں ذرا شہر کی طرف۔ رات آتے آتے دیر ہو جائے گی۔ مگر آپ جاگتی رہیں۔ گپ شپ کریں گے"۔

وہ خاموش رہی۔ کچھ نہیں بولی۔

"بائے"۔ وہ جاتے جاتے بولا۔

"بائے"۔ ہیزل نے کہا۔ اور —

اِس نئی مصیبت کے بارے میں سوچنے لگی۔

معاً خیال آیا۔ آنٹی ناجیہ سے مشورہ لے۔

"سوتے وقت دروازہ اچھی طرح بند کر لو۔ چاہے کتنا بھی کھٹکائے جواب مت

دو۔ سوتی بن جاؤ۔ اور ہاں۔ اشرف سے کہو۔ دروازے کے عین آگے چارپائی ڈال کر سو جائے..."

"تھینک یو آنٹی۔ تھینک یو سو مچ"۔

"خدا تمہاری ہر مشکل آسان کرے۔ آمین"۔ انہوں نے خلوصِ دل سے اُسے دعا دی۔

"Love you, Auntie."

"Love you too. Beta."

اور — سلسلہ منقطع ہو گیا۔

کیا پہاڑیاں، کیا درخت، کیا دور دور تک پھیلی چراگاہیں — سبھی تو برف کی اوڑھنی اوڑھے تھے۔ اِس وقت بھی برف چپ چاپ گر رہی تھی۔ ایسے میں چلتی ہوا ہڈیوں کے آر پار ہو رہی تھی۔

کامران احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ہیزل بھی ساتھ تھی۔

دوپہر تک وہ لوگ شہر پہنچ گئے۔ پہلے عمدہ سا لنچ کیا۔ اور پھر شوپنگ میں لگ گئے۔ کامران ہی کر رہا تھا سب۔ کہ ہیزل نے سب اُس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ جیولری تک اُس نے پسند کی۔ باقی جو چیزیں رہ گئیں۔ وہ کامران نے اپنے دوست کی بیوی کے ذمے ڈالنے پر چھوڑ دیں۔

رات گھِر آئی تھی۔ وہ لوگ ہیزل کے گھر کی طرف رواں دواں تھے۔ کامران بار بار اُسے چھیڑ رہا تھا۔ ایڈوانسز کر رہا تھا۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں پیچھے جاؤں گی''۔ ہیزل نے بہانہ بنایا۔

کہ کامران جب اُسے چھوتا تھا۔ تو اُسے گھِن آتی تھی، سخت کراہت محسوس ہوتی تھی۔

''یہی سیٹ بچھالیں۔ پیچھے جانے کی کیا ضرورت ہے''۔ کامران نے کہا۔

''نہیں پلیز! یہاں مجھے نیند نہیں آئے گی۔ آپ گاڑی روک لیں۔ میں پیچھے جاؤں گی''۔

''میں نہ روکوں تو؟''

''پلیز! میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں''۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''تھک گئی ہوں۔ سونا چاہتی ہوں''۔

اور — اُس نے بادلِ نخواستہ گاڑی روک دی۔

کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ گاڑی کبھی نہ روکتا۔ مگر ہیزل تھی ہی کچھ جاہ وجلال والی۔ وہ اُس سے اِمپریس ہی رہتا تھا۔ آج تک تو اُسے 'تم' کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ اور پھر وہ یہ بھی جانتا تھا' ہیزل ملک کے چند بڑے گھرانوں میں سے ایک تھی۔ اور وہ خود ایک اَپ سٹارٹ تھا۔ دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ مگر — وقت اور حالات کے پھیر تھے سب۔ عام حالات میں جسے وہ منہ بھی نہ لگاتی۔ آج اُسی کے رحم وکرم پر تھی۔ وہ چاہتی تو قانون کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی تھی۔ اِن باپ بیٹے کے تمام کرتوت برسرِ عام لا سکتی تھی۔ مگر — ماں تھی نہ باپ، نہ ہی کوئی بڑا بھائی۔ جو ساتھ چلتا' ساتھ دیتا۔

الٹا لینے کے دینے پڑ جاتے تو؟

''ڈیڈ کب آ رہے ہیں؟'' آج پھر اُس نے پوچھا۔ کہ ساتھ میں نادر بھی تو آ رہا تھا!

''ڈیڈ کبھی تاریخ تو بتاتے نہیں ہیں۔ بس اچانک آ جاتے ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہو گا''۔

''پر... کیوں نہیں بتاتے؟''

''سٹائل ہے اُن کا''۔ وہ مسکرایا۔

جبکہ یہ اُس کا سٹائل نہیں تھا۔ خود کو قانون سے چھپانا مقصود ہوتا تھا۔ آنے جانے کی تاریخ بھی نہیں بتاتا تھا۔ ساتھ میں سفر بھی مختلف ناموں کے پاسپورٹس اور شناختی کارڈز سے کرتا تھا!

اُس نے گہری سانس لی۔ پھر تھکی تھکی آنکھیں بازو سے ڈھک لیں۔

پتہ نہیں زار کے گھر والوں کا کیا حال ہوگا؟ اُس کی والدہ کا؟ اُس کی نانی کا؟ چاہتے ہوئے بھی اُس نے اُنہیں کونٹیکٹ نہیں کیا تھا۔ ہمت ہی نہیں پڑی تھی۔ اور پھر پتہ نہیں وہ اُسے ٹھیک سے جانتے بھی تھے یا نہیں؟ اچھا سمجھتے بھی تھے یا نہیں؟ زار تو کہا کرتا تھا کہ اُس کی والدہ اور نانی اُس سے ملنے کی خواہشمند تھیں۔ مگر — کیا پتہ یوں ہی اُسے خوش کرنے کو کہہ دیا تھا!

پھر اُسے نادر کا خیال آیا۔ کیسا لگتا ہوگا؟ گیارہ سال کا ہو گیا تھا۔ بڑا ہو گیا ہوگا۔ کتنا پیارا تھا...

ساتھ ہی اُس کے آنسو نکل آئے۔ دھیرے سے اُس نے انگلیوں کی پوروں سے خشک کیے۔ ایک گہری اداس سانس لی۔ اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے

لگی۔ مگر—

نیند کہاں؟ کاش وہ زار سے ملی ہی نہ ہوتی۔ کاش نادر اُس کے پاس رہ سکتا۔ کاش— وہ پیدا ہی نہ ہوتی!

پھر— وہ چونکی۔ کامران کے ہاتھ میں وہسکی کی بوتل تھی۔ جو وہ بار بار منہ سے لگا لیتا تھا۔

اُسے سخت کراہت محسوس ہوئی۔ کون سی برائی تھی جو اُس میں نہیں تھی۔

اور— اُس نے باقی کی زندگی اِسی غلاظت کے ڈھیر کے ساتھ گزارنا تھی!

اچانک اُس کا دل چاہا۔ چلتی کار سے کود جائے۔ مگر زندہ نہ بچے۔ پھر خیال آیا۔ شادی میں تو ابھی چند دن باقی تھے۔ کیوں نہ کوئی زہر لیکر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ مگر ساتھ ہی خیال آیا نادر کیا کرے گا؟ اکیلا رہ گیا۔ تو یہ لوگ تو اُس کے پرخچے اڑا دیں گے۔

کتنی بے بسی تھی؟ کتنی بے کسی تھی؟

رات کا ایک بج رہا تھا۔ جب وہ لوگ ہیزل کے ٹاؤن میں داخل ہوئے۔ گھر پہنچتے پہنچتے مزید پندرہ منٹ لگ گئے۔

ہیزل گاڑی سے اتری تو خدا کا شکر کیا۔

تیزی سے اوپر اپنے کمرے میں گئی۔ اور اندر سے کمرہ لاک کرتے ہوئے اپنے سیل پر اشرف بابا کو فوراً دروازے کے آگے اُن کی چارپائی لگانے کو کہہ دیا۔

خود جلدی جلدی نائیٹ سوٹ پہنا۔ اور لائیٹ آف کرتے ہوئے بستر میں گھس گئی۔

سونے کی کوشش کی۔ مگر— نیند تو یوں روٹھ گئی تھی۔ جیسے اُس کی قسمت اُس سے

روٹھ گئی تھی!

دو تین دن ہی رہ گئے تھے ذوالفقار شاہ کے آنے میں۔

نادر بھی تو آ رہا تھا۔ اُس کی جان۔ اُس کے ماں باپ کا جنتا۔ مگر—

یہ کیسی خوشی تھی کہ جس کے ساتھ ہی قیامت بھی برپا ہونے والی تھی!

آکاش پر بادل ہی بادل تھے۔ دھرتی پر برف ہی برف۔

اپنے بیڈ روم کی چوڑی خوبصورت کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی وہ دور دور تک نگاہیں دوڑا رہی تھی۔ دور پہاڑیوں پر برف سے لدے قد آور درخت، برف سے ڈھکی ڈھلانیں اور— تاحدِ نگاہ برف سے اَٹی ابھری ابھری چراگاہیں!

آج جانے کیا بات تھی۔ اُسے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ صبح کے پانچ بج گئے پھر چھ۔ اُٹھ کر وہ واش روم گئی۔ ہاتھ منہ دھوئے اور اپنے لئے کچن سے ایک کپ چائے منگواتے ہوئے یہیں آ کر کرسی پر بیٹھی۔ اور برف کے بحرِ بیکراں میں کھوگئی۔

اشرف بابا نے دروازے پر دستک دی۔ تو اُس کی محویت ٹوٹی۔

"آ جائیں بابا"۔

بابا اندر آ گئے۔ چائے میز پر لگا لی۔

"ناشتہ لاؤں سرکار؟"

"بعد میں بابا۔ تھینک یُو"۔

اشرف بابا خالی ٹرے لئے واپس چلدیئے۔

تبھی — اُس کا سیل فون بج اٹھا۔ آنٹی ناجیہ تھیں۔ پر — اتنی صبح صبح؟

"السلام علیکم آنٹی"۔

"وعلیکم سلام۔ تم سو تو نہیں رہی تھیں"۔

"نہیں۔ آج پتہ نہیں کیوں۔ نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ پانچ بجے کی جاگ رہی ہوں"۔

"اچھا سنو۔ ٹی وی لگاؤ۔ 'جیو' چینل..."

"کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہاں۔ ذوالفقار شاہ اور کامران دونوں ایئرپورٹ پر ہی گرفتار ہو گئے ہیں۔ انسانی سمگلنگ اور بے شمار جرائم کے الزام میں۔ جلدی دیکھو۔ بار بار نیوز سٹرپ پر آ رہا ہے..." انہوں نے فون بند کر دیا۔

ہیزل کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ ہاتھ پاؤں کام کرنا چھوڑ گئے۔ چند پل بے حِس و حرکت کرسی پر بیٹھی رہی۔

پھر — اُٹھی۔ اور — پرائیویٹ چینل 'جیو' لگا لیا۔

پہلے تو نیوز سٹرپ پر چند اور خبریں آتی رہیں۔ وہ مایوس ہونے کو ہی تھی کہ — 'ذوالفقار شاہ اور اُس کا بیٹا کامران شاہ ایئرپورٹ پر گرفتار کر لئے گئے۔

انسانی سمگلنگ، قتل اور مختلف سنگین جرائم میں ایک عرصہ سے F.I.A. کو مطلوب تھے'۔

سٹرپ بار بار آتی اور جاتی گئی۔ ہیزل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کہ ہنسے یا روئے!

اور پھر — اُسے نادر کا خیال آیا۔ وہ کہاں ہوگا؟

اُس نے فوراً آنٹی کو فون کیا۔

"آنٹی نادر کا کیا بنا ہوگا؟ وہ کہاں ہوگا؟" وہ سخت اَپ سیٹ لگ رہی تھی۔

"ایئرپورٹ کا تو ٹی وی سے پتہ چل گیا ہے ... میں فلائیٹ انکوائری سے پتہ کرتی ہوں..." وہ خود ہی بولی۔

"تمہیں پتہ ہے وہ کس فلائیٹ سے آ رہے تھے؟"

"نہیں آنٹی۔ نہ مجھے کوئی اِنٹرسٹ تھا جاننے کا۔ نا ہی کامران نے بتایا تھا۔ ڈیڈ ہمیشہ اپنا آنا آخری وقت تک disclose نہیں کرتے۔ میں کوشش کرتی ہوں۔ بائے آنٹی"۔

وہ لینڈ لائین پر ایئرپورٹ کی فلائیٹ انکوائری کا نمبر ملانے ہی کو تھی۔ کہ اُس کا سیل فون ایک بار پھر بج اُٹھا۔

"نادر میری جان۔ تم کہاں ہو؟ ٹھیک تو ہو نا؟"

نادر تھا۔ ایئرپورٹ سے بول رہا تھا۔

"باجی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ڈیڈ اور کامران بھائی کو F.I.A. گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ میں ایم ڈی کے آفس میں ہوں۔ بس روانہ ہونے ہی والا ہوں۔ یہ لوگ مجھے آپ کے پاس لیکر آ رہے ہیں..."

"کہو تو میں آ جاؤں؟"

"نہیں باجی۔ یہ لوگ ہیں نا میرے ساتھ۔ اچھا بند کرتا ہوں۔ ہم لوگ بس نکلنے ہی والے ہیں"۔

"او کے میری جان۔ Take care"

اوہ خدایا— کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی؟

گھٹنوں پر سر رکھ کر وہ بے اختیار رو دی۔ ڈھیر سارا رو دی۔ اُس نے کبھی خوشی نہیں دیکھی تھی۔ اگر دیکھی بھی تھی تو یاد نہیں تھی۔ وہ فرش پر سر بسجود ہو گئی۔ اپنے رب کے حضور وہ اِس انہونی خوشی کا نذرانہ صرف اپنے آنسوؤں سے دے سکتی تھی۔ اور یہ وہ بے دریغ لٹانے لگی۔

دل کا غبار نکال چکی۔ تو اُس نے آنٹی کو نادر کے فون اور اُس کے گھر روانہ ہونے کی اطلاع کر دی۔ پھر—

اشرف بابا کو بلایا۔

"بابا"۔ اُس نے اپنا سر اُن کے کندھے پر رکھ دیا۔ "نادر آ رہا ہے بابا"۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔ مبارک ہو بیٹی"۔ وہ اُس کا سر اپنے جھریوں بھرے کانپتے ہاتھ سے سہلا رہے تھے۔

"بابا۔ ڈیڈ اور کامران کو ایئر پورٹ پر ہی ایف آئی اے نے گرفتار کر لیا ہے..."

"کیا؟" بابا نے حیرت سے کہا۔ جیسے اتنی بڑی خوشخبری کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں بابا"۔ وہ رو بھی رہی تھی۔ اور مسکرا بھی رہی تھی۔ "آپ ہی تو کہتے تھے۔ اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں"۔

"ہاں بیٹا۔ لیکن اللہ نے دیر بھی نہیں کی۔ ورنہ وہ تو آتے ہی آپ کو ہمیشہ کے لئے دوزخ کی آگ میں ڈال رہے تھے۔ اور ننھے سے نادر سرکار کو ساری عمر کے لئے

یرغمال بنا تھا۔ مالک!" اُنہوں نے نظریں اوپر کیں۔ "تُو ہی تُو ہے۔ بس تُو ہی تُو ہے۔ اور کچھ نہیں ہے۔ صرف تُو ہی تُو ہے..."

کئی لمحے یوں ہی بیت گئے۔ ہیزل اب بھی بابا کے کندھے پر سر رکھے تھی۔

پھر بابا نے اُسے سر پر شفقت بھرا بوسہ دیا۔

"آپ منہ دھو لیں بیٹا۔ میں آپ کے لئے ناشتہ لاتا ہوں"۔ وہ اُسے کندھے سے تھامے واش روم تک لے آئے۔

اُس نے کپڑے بدلے۔ بال برش کئے۔ اپنا پسندیدہ پرفیوم لگایا۔ اور ایک بار پھر کھڑکی کے پاس آ کر خوبصورت کشنڈ چیئر پر بیٹھ گئی۔

بابا ناشتہ لیکر آ گئے۔

"بیٹا شہد والا دودھ ضرور پینا۔ تم اکثر واپس بھیج دیتی ہو"۔ بابا کی آواز اور لب و لہجے میں خوشی چھلک رہی تھی۔

"بابا آج سے ہر روز پیا کروں گی"۔ اُس کی آواز میں بھی زندگی لوٹ آئی تھی۔

بابا برتن اُس کے آگے میز پر لگا کر خالی ٹرے لئے واپس چلے گئے۔

ہیزل ناشتہ کرنے لگی اور پھر—دھیان زار کی طرف چلا گیا۔

دو آنسو لڑھک کر اُس کے گالوں پر آ رہے۔ جنہیں اُس نے چپکے سے اپنی انگلیوں کی پوروں سے پونچھ لیا۔ گہری اداس سانس لی۔ اور پھر—

دھیان جھٹک دیا۔ کہ —اُسے اتنی بہت ساری خوشی ملی تھی۔ اُسے ناشکری نہیں کرنی چاہئے تھی۔ زار کی بس اتنی ہی زندگی تھی۔ اور یہیں آ کر انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ انسان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ ہاں البتہ —اُس کی موت اُسی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ یہ درد اُسے رہ رہ کر کچوکے لگاتا تھا۔ نہ وہ اُس سے ملتا۔ نہ یہ لوگ اُس کے

پیچھے پڑتے لیکن —وہ تو کسی دل لگی کی خاطر اُس سے نہیں ملا تھا۔ ڈیوٹی نبھا رہا تھا اپنی!

بعض وقت ڈیوٹی کتنی جان لیوا ہوتی ہے!

''مگر —فرض تو نبھانا ہے۔ اپنے پروفیشن کی لاج تو رکھنی ہے۔ جان جائے تو جائے...'' اُس کے کاسل میں لنچ کے بعد اوپر، پیچھے والے ٹیریس پر بیٹھے باتوں کے دوران اُس کی کہی بات اُس کے کانوں میں گونجی۔

اُس نے سچ کہا تھا۔ اپنا فرض نبھاتے ہوئے ہی اُس کی جان گئی تھی۔ بے شک کہ وہ اُس دن اُسی سے ملنے آیا تھا۔ پر —نہ بھی آتا۔ تو انہوں نے اُسے چھوڑنا نہیں تھا۔ کیونکہ اِن کو شک ہو گیا تھا۔ کہ وہ اِن کے بارے میں جاننے لگا تھا!

ایک بار پھر اُس نے گہری سانس لی۔ دکھ تھا جس میں، درد تھا جس میں۔

بہر حال —اُس نے ناشتہ کیا۔ اور بابا کے کہنے کے مطابق دودھ کا گلاس اٹھا کر کھڑکی کے اُس پار تکتی گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔

اُس کا نادر آ رہا تھا۔ اُس کا چھوٹا سا بھائی۔ جو ساری زندگی ماں اور بہن کے پیار کے لئے ترسا تھا۔

نو بج رہے تھے۔ اُس نے کک کو اوپر اپنے کمرے میں بلایا۔

نادر کے لنچ کیلئے انواع واقسام کی چیزیں تیار کرنے کو کہا۔ اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ کہ نادر کی پسندیدہ ڈش کیا تھی؟ بس اندازے سے کہتی رہی۔

''جو حکم سرکار''۔ کک نے کہا۔ اور ناشتے کے برتن اٹھاتے ہوئے باہر نکل گیا۔

ہیزل وہیں بیٹھی رہی۔ پورے پانچ گھنٹے تھے نادر کو اُس کے پاس پہنچنے میں۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

اُس نے آنٹی ناجیہ کو فون کیا۔ ڈھیر ساری گپ شپ کی۔ پھر اپنا وارڈ روب کھولا۔ خاصا الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ وہ ٹھیک کیا۔ اُس کے بعد اپنے بک شیلف میں سے ایک کتاب نکالی۔ ایک بار پھر کھڑکی کے قریب بیٹھی۔ اور پڑھنے میں محو ہو گئی۔

پھر —

کچھ دیر کے لئے جیسے بھول ہی گئی۔ کہ پچھلے چند گھنٹوں میں کیا ہوا تھا؟ اور یہ کہ —نادر بھی آ رہا تھا!

تبھی — گیٹ پر ہلکا سا ہارن ہوا۔ وہ چونکی۔ وہ تو بھولی نہیں تھی۔ کان تو اُس کے ہارن پر ہی لگے تھے۔ کتاب کے اوراق شاید یوں ہی پلٹا رہی تھی!

بہر حال —بھاگی نیچے پورچ کی طرف۔

گاڑی ابھی گیٹ میں ہی تھی۔ کہ نادر نے دروازہ کھولا۔ اور بھاگتا ہوا ہیزل سے آ لپٹا۔

ہیزل کی عجیب حالت تھی۔ اُس کا چہرہ اُسکے ہاتھ چوم چوم کر، اُسے لپٹا لپٹا کر روتی جا رہی تھی۔

اشرف بابا بھی پاس کھڑے آنسو پونچھ رہے تھے۔ گاڑی گیٹ سے آ کر پورچ میں رک گئی۔

''بابا آپ نادر کو اندر لے جائیں۔ میں ذرا اِس بندے کا شکریہ تو ادا کروں''۔

بابا نادر کو اندر لے گئے۔ ہیزل گاڑی کی طرف بڑھی۔ اور —

ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے —زار باہر آ گیا۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتی وہ ساکت رہ گئی!

''میم۔ آپ کو بھائی کی آمد مبارک ہو۔ میں نے اپنی ڈیوٹی پوری

کرلی۔ذوالفقار شاہ اور کامران شاہ کو .F.I.A کی حراست میں دیدیا۔اب میں اجازت چاہوں گا۔خدا حافظ''۔اُس نے کہا۔اور —

قبل اِس کے کہ وہ سکتے سے باہر آتی۔وہ گاڑی میں بیٹھا اور — ریورس میں ہی چلتا گیٹ سے باہر نکل گیا۔

بوجھل سے قدم اٹھاتی وہ اندر آگئی۔

زار زندہ تھا۔بے پناہ خوشی کی بات تھی۔لیکن اُس کا لب ولہجہ اِس قدر اجنبی تھا۔ کہ ساری خوشی کافور ہوگئی۔

اگر وہ زندہ تھا،تو نیوز سٹرِپ پر کیا آ رہا تھا؟ اور — جب زندہ تھا۔تو اتنا عرصہ اُسے کال کیوں نہیں کر رہا تھا؟

اوہ — تو بقول اُس کے وہ صرف اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا تھا!

بہر حال — یہ کافی غور طلب events تھے۔زار زندہ تھا۔یہ ہی کافی تھا۔

اور — اِس وقت وہ صرف نادر کے پاس رہنا چاہتی تھی اور بس!

نادر اوپر اُس کے بیڈروم میں تھا۔وہ وہیں چلی گئی۔

اور پھر — باتوں کا،لاڈ اور پیار کا،جو سلسلہ چل نکلا۔تو چلتا چلا گیا۔

لنچ پر بھی بھائی بہن گپ شپ کرتے رہے۔دوپہر کو نادر سو گیا۔جیٹ لیگ تھا۔ سوتا ہی رہا۔

ہیزل البتہ بے چین سی تھی۔ساری دوپہریوں ہی چھت کو گھورتے گزار دی۔

ہر سُو شام بسیرا کرنے لگی تھی۔چاروں اُور برف ہی برف پڑ رہی تھی۔اور — یخ بستہ ہوا ہڈیوں کو چیرتی گزر رہی تھی۔

وہ نادر کے بیڈروم میں جھانکی۔تھکن سے نڈھال وہ اب بھی سو رہا تھا۔

وہ دبے قدموں واپس لوٹ آئی۔اپنے کمرے میں گئی۔تیار ہوئی۔اور باہر آگئی۔

''بابا۔میں ذرا کام سے جا رہی ہوں۔نادر کا خیال رکھئے گا''۔

''بے فکر ہو کر جائیں''۔بابا نے کہا۔

وہ — سیدھی 'Jade Hills Hotel' پہنچ گئی۔پارکنگ میں کار کھڑی

کی ۔ریسپشن میں زار کا پتہ کیا۔اُس کے اندازے کے عین مطابق وہیں ٹھہرا تھا۔ اِس بار بھی اوپر ٹاپ پر سویٹ تھا۔ آرام سے اوپر چلی گئی۔ دروازے پر دستک دی۔

کوئی رسپانس نہیں آیا۔ کہیں باہر تو نہیں نکل گیا تھا؟

ایک بار پھر دستک دی۔ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ شاید اندر سے بند نہیں کیا تھا۔

وہ بغیر کوئی آہٹ کیے اندر داخل ہوگئی۔ پھر دھیرے سے اُس کے بیڈ روم میں جھانکی۔ اوندھا پڑا تھا بستر میں۔

وہ آہستہ سے آگے بڑھی—

زار پہلے سے جاگ رہا تھا۔ دروازہ چونکہ کھلا تھا، اٹھ کر کھولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اِس لئے آرام سے آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ہیزل کے بیڈ روم میں آنے سے پہلے ہی اُس کے مخصوص پرفیوم کی اروما نے اُسے اُس کے آنے کی خبر دیدی تھی۔ وہ سوتا بن گیا۔

"مسٹر زار"۔ وہ جھکتے ہوئے اُس کے کان کے پاس کہنے لگی۔" آپ نے ذوالفقار شاہ اور کامران شاہ کو گرفتار کروایا۔ مبارک ہو۔ اب میں اپنی ڈیوٹی پوری کرنے جا رہی ہوں۔ آنٹی ناجیہ کا بیٹا امیریکہ سے آچکا ہے۔ اور فرائے ڈے کو ہمارا نکاح ہے۔ اب میں اجازت چاہوں گی۔ خدا حافظ۔" اُس نے بالکل اُسی کے چند گھنٹے قبل والے لب و لہجے میں کہا۔ اور—

واپس جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھی۔

زار کے تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ فوراً لپکا اُس کے پیچھے۔ زبردستی صوفے پر لا ڈھیر کیا۔

"ہلنا مت۔ میں چینج کر کے آتا ہوں"۔

وہ نائیٹ سوٹ میں تھا۔ جلدی سے ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کیے۔ بال درست کیے۔ اور دوبارہ بیڈ روم میں آ گیا۔

بیج کلر کے ٹراؤزرز اور مرون شرٹ میں وہ بہت ڈیشنگ لگ رہا تھا۔ ہیزل کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اچھا۔ تو میرے جانے کے بعد تم نے اور آنٹی ناجیہ نے یہ پروگرام بنایا تھا؟"

"نہیں۔ جانے کے بعد نہیں۔ آپ کے مرنے کی خبر کے بعد یہ خواہش ظاہر کی تھی آنٹی نے"۔

"اور تم بھی راضی ہوگئی تھیں؟"

"میں راضی ہو جاتی کہ نادر کو خدانخواستہ ذوالفقار شاہ مار ڈالتا؟"

"تو پھر ابھی کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

"وہی جو—نادر کو چھوڑتے وقت آپ کہہ رہے تھے"۔

زار نے گہری سانس لی۔

"میں تم سے نہیں جیت سکتا"۔

"اور میں آپ سے نہیں جیت سکتی"۔

زار نے اُسے دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔ دیوانہ وار پیار کرنے لگا۔

"میں تو کبھی کا تمہارے آگے سرنڈر کر چکا ہوں"۔ وہ جذبات سے بھاری آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

وہ چپ تھی۔ اُس کے چوڑے سینے سے لگی اُس کے دل کی دھڑکنیں سن رہی تھی۔ اُس کی گرم مہکتی سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ اُس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں بے خودی ہو رہی تھی۔

کتنے ہی پل بیت گئے۔ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔

''ہیزل''۔ زار نے ہی خاموشی کو توڑا۔

''جی''۔ وہ سر اُٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔

''میرے مرنے کی خبر کا کیا قصہ ہے؟''

ہیزل نے گہری سانس لی۔ ٹھیک ہو کر بیٹھی۔

''جب آپ آنٹی کے گھر سے چلے گئے۔ تو یاد ہے کچھ دیر بعد میں نے آپ کو میسج کیا تھا۔ کہ کامران آ گیا ہے۔ and be careful''۔

''ہاں یاد ہے۔ پھر کیا ہوا؟''

''اُس رات میں نے آپ کو بہت فون کیا۔ مگر آگے سے بند ملا اور... اگلی صبح ٹی وی پر نیوز سٹرپ پر آنے لگا۔ 'کسی نامعلوم شخص نے ہوٹیل کے کمرہ نمبر سات میں مقیم علی نامی آدمی کو قتل کر دیا۔' اُس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔ سکتے میں چلی گئی تھی۔ پھر آنٹی ہوسپٹل لے گئیں۔ ڈاکٹر نے ایڈمٹ کروالیا۔ رات بھی وہیں رہی۔ اگلے دن واپس گھر آ گئی۔ مجھے اور آنٹی کو پورا یقین تھا۔ کہ آپ کو کامران نے قتل کروایا ہے...''

زار نے تھکی سی سانس لی۔

''باپ رہے — اور تمہارے میسج کے بعد میں ہوٹیل گیا۔ بجائے رات گزارنے اور صبح کی فلائیٹ کا انتظار کرنے کے، اپنا سامان اُٹھایا۔ اور راتوں رات ٹرین سے چل نکلا۔ کہ اب وہ جگہ اور وہ ہوٹیل میرے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یقیناً میری جگہ کوئی اور 'علی' اُس کمرے میں جا کر ٹھہر گیا تھا۔ اور میری جگہ کامران نے اُس بیچارے

کو مروا ڈالا۔ بہر حال —

مجھے اُس نیوز کا پتہ نہیں چلا۔ ورنہ ضرور تمہاری غلط فہمی دور کرتا۔ اور پھر اُس کے بعد میں بہت سنجیدگی سے اپنے کام میں لگ گیا۔ کیونکہ ذوالفقار شاہ کے آنے میں صرف دو ہفتے تھے۔ اور اِن دو ہفتوں میں مَیں نے بہت کچھ کرنا تھا۔ سب سے پہلے میں اپنی ٹیم کے ساتھ دوبئی گیا۔ ذوالفقار شاہ کے بارے میں معلومات اور ثبوت اکٹھے کئے۔ سکول میں نادر سے فون پر بات کی اُس سے ملنے کی۔ مگر اُس نے بتایا کہ ذوالفقار شاہ کے علاوہ کسی اور کو اُس سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ سو فون پر ہی رابطہ کرتا رہا۔ نو دس دن تو وہاں لگ گئے۔ پھر واپس آ کر باقی کے دن F.I.A. کے ساتھ ڈِسکشنز ہوتی رہیں۔ معاملات طے ہوتے رہے۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ کہ کب کہاں اور کس فلائیٹ سے وہ آ رہا تھا۔ کیونکہ اُس کا نام کراچی، لاہور، اسلام آباد، کسی بھی جگہ پسنجرز کے لِسٹ میں موجود نہیں تھا۔ پر — تمام ایئرپورٹس پر F.I.A. الرٹ تھی۔ تبھی — پلین کے مطابق رات نادر نے گھر سے روانہ ہونے سے قبل مجھے فون پر انفارم کیا۔ کہ وہ لوگ کہاں کے لئے اور کس فلائیٹ سے روانہ ہو رہے ہیں۔ سو — میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ اور پھر — جوں ہی ذوالفقار شاہ پسنجرز لاؤنج میں داخل ہوا۔ F.I.A. نے اُسے دھر لیا۔ لاؤنج سے باہر اُس کے استقبال میں کھڑے کامران کو بھی ہتھکڑیاں لگا دیں۔ اور — کچھ دیر بعد میں نے ایم ڈی کے آفس سے نادر کو لیا اور — تمہارے پاس پہنچ گئے...''

''اور اِس تمام عرصے میں آپ نے یہ ذکر نہیں کیا۔ کہ مجھے اتنے دنوں میں آپ نے کونٹیکٹ کیوں نہیں کیا؟''

''کوئی اور وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ کامران میری اور تمہاری ہر موؤمنٹ

سے باخبر رہتا تھا۔ میں کار کی بجائے کراچی سے پلین میں صرف اِس لئے آیا تھا۔ کہ اُسے خبر نہ ہو۔ پھر بھی اُسے پتہ چل گیا۔ ہوٹیل سے بھی اِسی لئے اُسی وقت چل پڑا۔ پلین کی بجائے ٹرین سے بھی اِسی لئے روانہ ہوا۔ کہ ظاہر ہے اُسے میرے ائر ریٹرن ٹکٹ کا بھی پتہ تھا۔ اِس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ میرا پیچھا کریگا۔ وہ تم سے ملنے نہیں آیا تھا۔ صرف میرا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا۔ اور تم نے دیکھ لیا نا کہ مجھے follow کرتے کرتے اُس نے ایک اور بے گناہ کو قتل کروا دیا۔ میں تمہارے ساتھ اِس لئے کوئی کونٹیکٹ نہیں رکھ رہا تھا۔ دو ہفتے تھے۔ گزر جانے تھے۔ مگر کونٹیکٹ خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا۔ کہ نیوز میں یہ بات آئی ہے۔ تم پر جو گزری اُس کے لئے مجھے افسوس ہے...''

پھر اچانک وہ زور سے ہنس پڑا۔

''جبھی تم مجھے زندہ دیکھ کر حیران اور پریشان لگ رہی تھیں''۔

''بس کریں۔ مجھ پر جو گزری ہے آپ اندازہ نہیں کرسکتے''۔

''اچھا معاف کردو پلیز! دیکھو اِس میں میری تو کوئی غلطی نہیں تھی نا''۔

''چلیں۔ اب میرے لئے ایک کپ کوفی بنائیں...''

''پھر معاف کردو گی؟''

''ہاں''۔

وہ اٹھنے لگا۔

''بیٹھیں آپ۔ کیا آپ اور کیا آپ کی کوفی ہوگی''۔ وہ اب بھی روٹھی روٹھی سی تھی۔

زار کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔ وہ بھی اُس کے ساتھ چھوٹے سے پیارے سے کچن

میں آ گیا۔

ہیزل نے پانی ابالنے کو رکھا۔ اور دو کپس میں کوفی پھینٹنے لگی۔

''اچھا یہ کیا ڈرامہ تھا۔ کہ میں نے اپنی ڈیوٹی پوری کرلی۔ اب اجازت چاہوں گا...''

اُس کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا۔

''نمبر وَن — تمہیں چار سال بعد نادر سے ملنے کو۔ نمبر ٹو — تمہیں تنگ کرنے کو''۔

''اتنا سیریس بن کر؟''

''سیریس نہ بنتا۔ تو تم میرے پیچھے آتیں؟''

''ہٹیں آگے سے ورنہ ماروں گی''۔ وہ جو اُس سے اتنا جُڑ کر کھڑا تھا کہ اُسے کوفی بنانے میں بھی مشکل ہو رہی تھی!

''نہیں ہٹوں گا''۔ اُس نے نمک کا چمچ بھر کر اُس کے کپ میں پھینٹی ہوئی کوفی میں ڈال دیا۔

''یہ آپ پئیں گے''۔

اُس نے ایک اور چمچ بھر کر دوسرے کپ میں بھی ڈال دیا۔

ہیزل نے اُسے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ پھر ایک دھکا دیکر چھوٹے سے کچن کی دیوار سے لگا دیا۔

''بس وہیں رہیں۔ مجھے کام کرنے دیں''۔

اُس نے دونوں کپ صاف کیئے۔ پھر سے کوفی ڈالکر پھینٹنے لگی۔

وہ پھر آگے بڑھا۔ اُس کی نظریں بچا کر کالی مرچ میں سے چمچ بھرا اور —— جلدی

سے ہیزل والے کپ میں ڈال دیا۔

''یہ بھی آپ پئیں گے''۔

زار نے آرام سے دوسرا چمچ بھرا اور دوسرے کپ میں بھی انڈیل دیا۔

وہ رونے کو آ گئی۔

''یہ کوفی بنے گی یا نہیں؟'' وہ جل کر بولی۔

''ضرور بنے گی''۔ وہ اطمینان سے بولا۔ ''مگر تم سے نہیں۔ کبھی نمک ملا دیتی ہو کبھی مرچ۔ کوفی ایسے بنتی ہے۔ ہٹو۔ میں بناتا ہوں''۔

اور پھر واقعی کوفی اُسی نے بنائی۔ ٹرے میں کپس رکھے۔ اور ——

''آؤ باہر بالکنی میں بیٹھتے ہیں''۔ اُس نے کہا۔

''زار صاحب''۔ وہ ساتھ ساتھ چل پڑی۔ ''یہ گرمی کا موسم نہیں ہے''۔

''سردی کا بھی نہیں ہے''۔

''پھر کس چیز کا ہے؟''

''پیار کا''۔

اور —— ہیزل نے گہری سانس لی۔

دونوں بالکنی میں سٹیل کی خوبصورت کشنڈ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اچھا تھا بالکنی کے اوپر شیڈ تھا۔ ورنہ برف کے فلیکس تو قدم بھر پر ہی دبے پاؤں گر رہے تھے۔

رات اپنے سیاہ پَر پھیلا چکی تھی۔ ہوٹیل کے یہاں وہاں بکھرے سوئٹس میں موہوم سی روشنیاں جیسے راز سے لئے تھیں۔ بل کھاتی سڑک پر سے گزرتیں اِکا دُکا گاڑیوں کی مدھم سی بتیوں میں جیسے بھید سے تھے۔ اور —— دور اُس پار پانیوں کی سطح پر چلتی ایک اکلوتی بارج کی لو پُراسرار لگ رہی تھی!

''یہاں رات کو اکیلے میں تو بندے کو ڈر لگتا ہوگا''۔ ہیزل دھیرے سے گویا ہوئی۔

زار کا جاندار قہقہہ بلند ہوا۔

اپنا کپ ٹیبل پر رکھا۔ اور ہیزل کو اپنے پہلو سے جکڑ لیا۔

''بندے کو نہیں بندی کو ڈر لگ رہا ہے —— ورنہ تو یہی سین میں ہر رات یہاں کھڑے ہو کر کتنی کتنی دیر دیکھتا رہتا تھا''۔

''اور ... اُس بارج میں انسان نہیں اپنے لمبے بال کھولے کوئی بہت خوبصورت چڑیل ہو۔ اور بارج کی روشنی کی اٹریکشن دکھا کر لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنے پاس بلاتی ہو...''

''تو سب سے پہلے تو میں پہنچ جاؤں گا'' اُس کی imagination پر اپنی ہنسی بمشکل روکتے ہوئے زار بہت سنجیدگی سے بولا۔

''اور میں آپ کو مار ڈالوں گی''۔

''تم بھی چڑیل ہو؟'' اُس کی سنجیدگی اِسرار میں بدل گئی۔

''میں کیوں چڑیل ہوں''۔ وہ واقعی جیسے سہم سی گئی۔

''تم ہی تو کہتی ہو مجھے مار ڈالو گی۔ اچھا مار دو گی۔ تو کچا کھاؤ گی یا روسٹ کرو گی؟''

''بس کریں۔ میں اندر جاتی ہوں''۔ وہ اپنا کپ لئے واقعی اندر چلدی۔

زار بھی اندر آ گیا۔ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ اپنی اپنی کوفی پینے لگے۔

اُس کی imagination پر وہ دیر تک ہنستا رہا۔ اُسے چھیڑتا رہا۔

''مجھے نہیں پتہ تھا۔ کہ تم ڈرپوک بھی ہو''۔

''اور مجھے بھی نہیں پتہ تھا کہ آپ ہر خوبصورت لڑکی کے پاس سب سے پہلے پہنچ

جائیں گے۔ چاہے وہ چڑیل ہی کیوں نہ ہو"۔ اُس کے لہجے سے جیلسی کی بو آ رہی تھی۔

اُس کے جاندار قہقہے گونجنے لگے۔

"میرا دماغ خراب ہے کہ ایسا کروں۔ کہ تم مجھے مار ڈالو۔ اور پھر — کیا کہا تھا تم نے؟ کچا کھانے کو یا روسٹ کر کے کھانے کو؟"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا"۔

"باربی کیو کرنے کا کہا تھا شاید"۔ وہ باز نہیں آ رہا تھا۔

"سُوپ بنانے کا کہا تھا"۔

"واؤ — میں بچارا"۔

"آپ بچارے نہیں ہیں"۔

"پھر؟ — کیا ہوں؟"

"آپ بہت بُرے ہیں"۔ اُس نے 'بُرے' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری مجبوری ہے..."

"کیا مجبوری ہے؟"

"کہ آپ کو like کرتی ہوں"۔

"بس؟ Like?"

"ہاں"۔ اور —

ساتھ ہی وہ کشن اٹھا اٹھا کر اُسے مارنے لگی۔ وہ ہنستا رہا۔ وار بچاتا رہا۔ اور وہ — مارتی گئی۔

پھر — زار نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ سینے سے لگا لیا۔

"کہو۔ You love me"

"No. I don't." وہ ہنس بھی رہی تھی۔

"And I hate you too." زار اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ کی آنکھیں آپ کی بات کا ساتھ نہیں دے رہیں"۔

اور — زار اُسے بے تحاشا پیار کرنے لگا۔

بہت سارے پل یوں ہی گزر گئے۔

پھر زار ہی کو خیال آیا۔

"ہیزل۔ تمہیں چلنا چاہئے۔ مجھے رات کو لڑکیوں سے ڈر لگتا ہے۔" اُس کی شکل بہت مسکین تھی۔

ہیزل بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دی۔

"خاص کر ایسی لڑکی سے جس کی ہنسی کبھی پریوں کے دیس میں بجتے پائیلوں جیسی ہو، کبھی ٹھنڈے میٹھے جھرنوں جیسی..."

"اپنے قہقہوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اُس کا سر اب بھی اُس کے گھٹنے پر رکھا تھا۔

"پتہ نہیں"۔

"سارا سارا دن charmed رہتی ہوں میں"۔

زار نے اُس کی دونوں آنکھوں پر باری باری پیار کیا۔

"اور یہ تمہاری جادوگر آنکھیں مجھے ساری ساری رات سونے نہیں دیتیں..."

چند پل وہ دونوں یوں ہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تھے۔

پھر — جانے کہاں سے ہیزل کو صدف کا خیال آ گیا۔

''آپ کو پتہ ہے دو تین دن پہلے ایک صدف نام کی لڑکی مجھے ملنے آئی تھی...''

زار کے کان کھڑے ہوئے۔ حیرت سی بھی ہوئی۔

''اچھا۔'' اُس نے مختصراً کہا۔

''کہتی تھی۔ کامران نے سال بھر پہلے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کی ہے۔ وہ مجھے خبردار کرنے آئی تھی۔ کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اور اب اُس کا باپ زبردستی اُس کی شادی مجھ سے کروا رہا ہے... مزید۔ کہ وہ کامران کی مسٹریس ہے۔ اُس کے لئے جان اور عزت داؤ پر لگا کر اُس کی خواہشات پوری کرتی رہی ہے۔ اور کہ — کامران نے اُس سے وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر کہیں وہ اُس سے پریگننٹ ہوئی۔ تو وہ اُس سے شادی کر لے گا۔ اب وہ واقعی پریگنیٹ ہے۔ مگر کامران کہتا ہے کہ وہ abortion کروا لے۔ جب اُس نے انکار کیا۔ تو اُس نے اُسے قتل کر دینے کی دھمکی دیدی...''

زار نے گہری سانس لی۔

''وہ اُسے قتل کر چکا ہے...''

''کیا؟'' وہ سہم کر رہ گئی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اُسی کے قتل کے الزام میں تو اُسے سزا ہوئی ہے۔ باقی لوگوں کو تو وہ دوسروں سے مرواتا تھا۔ اِس بار اُس نے خود اُس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اُسے مار دیا تھا۔ جس جگہ اُس نے مجھے بند کر رکھا تھا۔ اُسی ویران اجاڑ بنگلے کے ایک بیڈ روم میں اس نے صدف کو قتل کیا تھا۔ چشم دید گواہ وہی چوکیدار نیک محمد تھا۔ جس نے میری مدد کی تھی۔ اور مجھے ڈیڑھ سو روپے دیئے تھے۔ اِس دوران میں اُسے بھی ملا تھا۔ کچھ ثبوت اکٹھے کرنے تھے۔ جب میں وہاں قید تھا۔ تو وہ ذوالفقار شاہ اور کامران لوگوں سے بہت

ڈرتا تھا۔ مگر جب میں دوبارہ اُسے ملا۔ اور اُس کو اور اُس کے خاندان والوں کو وہاں سے نکال کر عزت کی زندگی کی ضمانت دی۔ تو اُس نے پولیس کے سامنے بہت کچھ اُگل دیا۔ ساتھ میں پولیس جو صدف کے لئے سرگرداں پھر رہی تھی۔ اُس کو صدف کے قاتل اور آنکھوں دیکھا حال بھی بتا دیا...''

''او مائی گوڈ!'' وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

پھر — کافی دیر چپ رہی۔ زار بھی چپ تھا!

''And mery jan, you must leave now.'' زار نے خاموشی توڑی۔

''ہاں۔ بہت دیر بھی ہو گئی ہے''۔

''اِس میں میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا چلی جاؤ مجھے رات کو لڑکیوں سے ڈر لگتا ہے''۔

ہیزل ایک بار پھر ہنس دی۔ وہی پریوں کے دیس میں بجتی گھنٹیوں کی سی ہنسی!

''چلو تمہیں چھوڑ آؤں''۔

دونوں سویٹ سے نکل کر نیچے پارکنگ میں اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھے۔ اور ہیزل آگے اور زار پیچھے چل دیا۔

شام متوالی تھی، موسم سہانا۔ ایسے میں رات کی رانی کی مہک جادو جگا رہی تھی۔

شائستہ اور نانو حسبِ معمول باہر وسیع و عریض نفاست سے تراشیدہ لان میں بیٹھیں باتیں کر رہی تھیں۔

''آج تین سال ہو گئے خیر سے زار کی شادی کو''۔ شائستہ بولیں۔

''ہاں۔ کیسے پلک جھپکتے میں گزر گئے''۔ نانو نے کہا۔

''بالکل۔ لگتا ہے کل کی بات تھی۔ کتنی دھوم سے ہوئی تھی شادی... ہفتہ بھر پہلے سے ہی زار کے دوست اکٹھے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ لڑکی والوں سے زیادہ تو زار کے دوستوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ طرح طرح کے کھانے اور مشروبات سرو ہو رہے

تھے۔ رات گئے تک ناچتے کودتے رہتے تھے۔ تھکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے... اور پھر زار کی تو چڑ ہی بنا لی تھی۔

'ہم نے تمہیں صرف ثبوت اکٹھے کرنے بھیجا تھا۔ تم پوری لڑکی کو ہی اٹھا لائے'۔ اُس کے صحافی دوست اُسے چھیڑتے۔

واقعی لگتا ہے کل کی بات ہے...'' شائستہ کی نظروں کے آگے زار کی شادی کے دن گھوم رہے تھے۔

''اب بھی کہاں لگتا ہے اتنا عرصہ ہوا ہے شادی کو۔ زار تو دیوانہ ہے ہیزل کا۔ کیسے بہانے بہانے چھیڑتا ہے۔ تنگ کرتا ہے۔ پھر سب کے سامنے پیار کر لیتا ہے...''

شائستہ بے ساختہ ہنس دی۔

''وہ ہے ہی بہت پیاری بچی۔ کبھی آپ نے محسوس کیا۔ اُس نے اپنی جاگیرداری دکھائی ہو۔ یا کبھی غرور کیا ہو...''

''ہاں یہ تو ماننا پڑے گا۔ بھلے ہمیں بھی کسی چیز کی کمی نہیں۔ مگر اُس کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے نا۔ لیکن مجال ہے جو کبھی احساس دلایا ہو۔ اور پھر ہمیں کتنی عزت دیتی ہے۔ زار کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ اُس کا ہر کام اپنے ہاتھ سے، اپنے وقت پر۔ پلکیں بچھائے رکھتی ہے اُس کی راہ میں۔ بھئی میں نے تو اس دور میں ایسی لڑکی نہیں دیکھی۔ اور وہ بھی ایسی کہ جس نے آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد نوکروں کی فوج دیکھی ہو۔ اور جنہوں نے اُسے کسی کام کو ہاتھ تک لگانے نہ دیا ہو... اور پھر... سچ کہوں تو مجھے تو سو فیصد یقین تھا۔ کہ وہ ہم سے الگ گھر میں رہے گی۔ کبھی اکٹھی نہیں رہے گی۔ مگر — آفرین ہے۔ خود ہی بولی۔ 'ہم ہمیشہ اکٹھے رہیں گے۔ زار آپ لوگوں کے بغیر نہیں رہ پائے گا

اور___میں نے تو اتنی تنہائیاں دیکھی ہیں۔ کہ آپ لوگوں کو پا کر میں خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے لگی ہوں...''

معاً___سامنے لاؤنج کا دروازہ کھلا۔ اور ہیزل نمودار ہوئی۔

''امی، نانو۔ پکڑیں اپنے پوتے کو''۔ اُس نے دو سالہ اسد کو اُنہیں پکڑا دیا۔ اسد کی آیا دو دن کی چھٹی پر تھی۔ اور اسد نے سب کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ''میں زار کے لئے سُوپ بنانے جا رہی ہوں...'' وہ خاصی جلدی میں تھی۔

''بیٹا سنو تو۔'' شائستہ بولیں۔

''جی امی''۔ وہ رک گئی۔

''اُس کے آتے ہی تو سب تم دونوں کی ویڈنگ اینیورسری سیلیبریٹ کرنے میریٹ جا رہے ہیں۔ پھر گھر پر سُوپ بنانے کی کیا ضرورت ہے''۔ اُنہیں بہرحال ہیزل کی فکر تھی۔

''ہاں امی۔ لیکن ابھی ابھی اُن کا آرڈر آیا ہے۔ کہ سوپ پھر بھی تیار ہونا چاہئے۔ اور وہ بھی میرے ہی ہاتھ کا''۔

''بالکل نہیں''۔ شائستہ بولیں۔ جب ڈنر ہی باہر کرنا ہے تو گھر میں سوپ بنانے کا کیا تک ہے''۔

وہ اپنے سیل فون پر جلدی جلدی زار کا نمبر ملانے لگیں۔

''بیٹا جب ڈنر پر باہر جا ہی رہے ہیں۔ تو گھر میں سوپ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟''۔

''تو شکایت لگ گئی میری؟'' وہ خوشگواری سے بولا۔

''لگنی ہی تھی۔ خواہ مخواہ تھکاتے ہو اُس کو''۔

''امی اچھا لگتا ہے نا''۔

''کیا اچھا لگتا ہے؟''

''جب وہ میرے لئے سوپ یا کوفی بناتی ہے۔ تو بہت اچھا لگتا ہے مجھے''۔ اُس نے کہہ ہی دیا۔

''تو یہ بات ہے''۔

''ہاں''۔

''پھر ایسا کرو۔ سوپ کل پر چھوڑ دو۔ میریٹ سے واپس آئیں گے۔ تو کوفی پلا دے گی۔ ٹھیک ہے''۔

آپ کہتی ہیں تو ٹھیک ہے''۔ وہ کچھ لاچاری سے بولا۔

''تنگ مت کیا کرو میری بہو کو''۔

''میں کب تنگ کرتا ہوں امی''۔

''سوپ کیا عزیز بنا کر نہیں دے سکتا؟'' اُنہوں نے اپنے کک کا نام لیا۔

''نہیں۔ اُس کو سوپ بنانا نہیں آتا''۔

''اور ہیزل کو کس نے سکھایا ہے بنانا؟''

ہیزل کو عزیز نے ہی سوپ بنانا سکھایا تھا۔ وہ بہترین کک تھا۔ پاکستانی اور چائینز کھانے بنانے میں ماہر تھا۔

''میں نے''۔ وہ آرام سے بولا۔

اُنہیں ہنسی آ گئی۔

''اچھا چھوڑو۔ میں جا رہی ہوں اسد کو نہلانے۔ تم بس جلدی گھر آ جاؤ''۔

''ٹھیک ہے''۔

شائستہ نے فون بند کر دیا۔ اور اسد کو لیکر اندر چلی گئیں۔

''نانو میں ذرا نادر کی طرف جاؤں؟'' ہیزل نے کہا۔

''ہاتھ بیٹا جاؤ''۔

اور ہیزل — ساتھ لگی کوٹھی کی طرف جانے لگی۔

ہیزل اور زار کی شادی ہوئی تھی۔ تو نادر اشرف بابا کے ساتھ اسی ساتھ والی کوٹھی میں ہیزل اور زار کی زیرِ نگرانی رہنے لگا تھا۔ اس طرح سے وہ ہیزل کے قریب بھی تھا۔ اور نظروں کے سامنے بھی۔

وہ گئی تو وہ اوپر اپنے کمرے میں تھا۔ تیار ہو رہا تھا ہیزل اور زار کی ویڈنگ اینیورسری کی سیلیبریشن کے لئے۔ وہیں لاؤنج میں بیٹھ کر اخبار الٹ پلٹ کرتے ہوئے وہ اُس کا انتظار کرنے لگی۔

پھر — سیڑھیوں میں بھاری سے قدموں کی آہٹ پر چونکی۔

سر اٹھا کر دیکھا۔ نادر تھا۔ سیاہ قیمتی سوٹ میں ملبوس بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ چودہ سال کا نادر اُسے اچانک بڑا بڑا، جوان اور گریس فل لگنے لگا۔

اُس کی چال میں وقار عود کر آیا تھا۔ انداز میں جلال سا آ گیا تھا۔

جانے کیوں؟ اُس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ عرصہ بعد اُسے خیال آیا۔ کاش! امی اور پاپا زندہ ہوتے! کاش آج نادر کو اس روپ میں دیکھ سکتے!

پھر — اُس نے جلدی سے آنکھوں ہی میں آنسو پی لئے۔ یہ کیا کم تھا۔ کہ وہ اور نادر آج آزاد تھے۔ ذوالفقار شاہ کے خونی چنگل میں نہیں تھے!

اُسے نادر پر بے طرح پیار آیا۔ اٹھتے ہوئے اُسے گلے سے لگا لیا۔

''You look so handsome Naadar.''

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

ہیزل دنگ رہ گئی۔ اُس کے ننھے سے نادر کے سائل میں جوانی کا غرور جھلک آیا تھا۔ وہ واقعی جوان ہو گیا تھا!

دونوں بہن بھائی بیٹھ گئے۔ ابھی وقت تھا ڈنر پر جانے میں۔ بیرا اُن کے لئے کرسٹل کے خوبصورت سمنڈ گلاسز میں تازہ چیریز کا جوس لے آیا۔

ہیزل نے گلاس اٹھاتے ہوئے منہ سے لگا لیا۔ تو نادر نے بھی اپنا گلاس اٹھا لیا۔

نادر کچھ سوچ رہا تھا۔ جیسے من میں کوئی بات تھی!

تبھی — ہیزل کو ڈھونڈتا زار وہاں آ گیا۔

فوراً ہی زار کے لئے بھی جوس آ گیا۔

''زار بھائی''۔ نادر گویا ہوا۔ ''کل سے میری چھٹیاں ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ کہ اب وقت آ گیا ہے۔ کہ میں اپنے اسٹیٹ پر چلا جاؤں۔ بے شمار کام pending پڑے ہیں وہاں۔ بس آپ سے اور باجی سے اجازت لینا تھی...''

ہیزل متحیر سی اُسے دیکھ رہی تھی۔ مارے خوشی کے اس وقت پھر آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس کا چھوٹا سا بھائی آج اتنا بڑا ہو گیا تھا۔ کہ اسٹیٹ کے کام سنبھالنے کی بات کر رہا تھا۔ اُس کا بوجھ ہلکا کرنے کی سوچ رہا تھا!

زار ہیزل کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے پوچھ رہا تھا۔ کہ اُس کا کیا خیال تھا اس بارے میں؟

کہ یہ بات ہیزل بھی زار سے کئی بار ڈسکس کر چکی تھی۔ کہ نادر جوان ہی اس قابل ہوگا۔ کہ اسٹیٹ پر اکیلا رہ سکے۔ تو وہ اُس اسٹیٹ پر چلا جائے گا۔ اسٹیٹ کے

کاروبار کی سوجھ بوجھ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ ساتھ ہی جس سکول سے ہیزل پڑھی تھی اُسی میں پڑھائی جاری رکھے گا۔ اٹھارہ سال کا ہوگا۔ تو گریجویشن کے لئے امیریکہ چلا جائے گا۔

''نادر ٹھیک کہتا ہے''۔ ہیزل کہنے لگی۔ ''ابھی ابھی میں دیکھ رہی تھی۔ ماشاءاللہ میرا بھائی جوان ہو گیا ہے۔ یہ وہاں اکیلا بھی رہ سکتا ہے۔ اور اسٹیٹ کو بھی سنبھال سکتا ہے۔ اسٹیٹ کی اونچ نیچ سمجھانے میں اشرف بابا اس کی مدد کریں گے۔ اور پھر— گرمیوں میں مَیں اِسے ملنے جایا کروں گی۔ اور سردیوں میں یہ ہمیں ملنے آیا کرے گا...''

''تم پھر جاؤ گی؟'' زار اچانک حسبِ عادت ہیزل کو چھیڑنے لگا۔

جبکہ اُسے معلوم تھا۔ وہ ہر بار گرمیوں میں زار کی ہی اجازت سے وہاں جایا کرتی تھی۔ دو مہینے گزار آتی تھی۔ کہ یہاں گرمیوں میں بے تحاشا گرمی پڑتی تھی۔

ہیزل گڑبڑا سی گئی۔ نادر بھی کچھ پریشان سا لگنے لگا۔

اُسے ہنسی آ گئی۔

''چلو ہو آؤ چند دن کے لئے''۔

''چند دن؟'' ہیزل آہستہ سے بولی۔

''زار بھائی۔ ہمیشہ کی طرح دو مہینے نہیں ہو سکتے؟'' اُس کے لہجے میں التجا تھی۔

کہ ہیزل اُس کی بہن بھی تھی اور ماں جیسی بھی۔

''اچھا ایک مہینہ رہ لو''۔ پھر اُسے دونوں پر ترس آ گیا۔ ''چلو دو مہینے سہی''۔ پھر وہ نادر کے قدرے قریب ہوا۔ ''مجھے بھی یاد آتی ہے نا یار''۔

''اوہ— یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا''۔ نادر خوشگواری سے بولا۔

''تم ابھی نہیں سمجھو گے۔ شادی کے بعد پوچھوں گا''۔

تینوں ہی ہنس دیئے۔

پھر— کل ہی نادر اور اشرف بابا کی فلائیٹ کا بندوبست کرنے کا کہہ کر تینوں زار کے یہاں چلے آئے۔

شاندار ڈنر کھانے کے بعد سبھی گھر واپس آ گئے۔

ہیزل اور زار کو سب نے باری باری قیمتی گفٹس دیئے۔ رات گئے تک محفل جمی رہی۔ سبھی خوش تھے۔ بے حد خوش۔

اسد سو گیا تھا۔ ہیزل اور زار اب بھی اپنے بیڈروم میں Love Seat پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

''میرا گفٹ؟'' ہیزل نے پوچھ ہی لیا۔

''اوہ گوڈ— مجھے تمہارے لئے گفٹ لینا یاد ہی نہیں رہا۔ ایک تو کام اتنا ہوتا ہے کہ...''

''اور اتفاق دیکھیں۔ میں بھی آپ کے لئے کچھ لینا بالکل ہی بھول گئی۔ ایک تو اسد اتنا بزی رکھتا ہے کہ...''

''چلو خیر ہے۔ میں نے تمہیں دنیا کا سب سے قیمتی تحفہ تو دیا ہی ہے''۔ زار نے خوبصورت Baby Cot میں سوئے اسد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ یہ تو ہے''۔ وہ محبت بھری نظروں سے اسد کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں بھی آپ کو بیش قیمت گفٹ پیش کرتی ہوں''۔

دونوں ہنسنے لگے۔ تو اسد جاگ گیا۔

ہیزل فوراً اُس کی طرف بڑھی۔ آہستہ آہستہ اُسے تھپکنے لگی۔ زار بھی وہیں آ گیا۔ دھیرے سے اُس کا ہاتھ تھاما۔ اور ڈائمنڈز سے مرصع خوبصورت بریسلٹ اُس کی کلائی میں پہنا دیا۔

''میں کیسے تمہارا گفٹ بھول سکتا ہوں''۔ اُس نے اُس کی کلائی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

اسد پھر سے سو گیا۔ ہیزل اور زار دوبارہ اپنی سیٹ پر آ بیٹھے۔

ہیزل نے زار کے آگے اپنی بند مٹھی کھولی۔ وہاں زار کی پسندیدہ کار کے نئے موڈل کی چابی تھی۔ اُس نے زار کا ہاتھ تھامتے ہوئے اُس پر چابی رکھ دی۔

''میں کیسے آپ کا گفٹ بھول سکتی ہوں''۔ اُس نے کہا۔ اور اُس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے چھو لیا۔

پھر — سر اُس کی گود میں رکھ لیا۔ زار نے جھکتے ہوئے اپنا چہرہ اُس کے خوبصورت مہکتے بالوں میں چھپا لیا۔ اور —

لمحے بیتتے چلے گئے۔